احساس و ادراک
مجموعۂ مضامین
پروفیسر بشیر احمد نحوی
میزان پبلشرز سرینگر کشمیر

Title

Author

Accession No.

Call No. 8

BORROWER'S NO.	ISSUE DATE	BORROWER'S NO.	ISSUE DATE

احساس و ادراک

(مجموعۂ مضامین)

پروفیسر بشیر احمد نحوی

ناشر

میزان پبلشرز بٹہ مالو سرینگر

انٹرنیشنل بک اسٹینڈ ارڈ نمبر

ISBN: 978-93-80691-44-2

نام کتاب	:	احساس وادراک
مصنف	:	ڈاکٹر بشیر احمد نحوی
اشاعت	:	جون 2011
تعداد	:	300
قیمت	:	350/

ناشر

میزان پبلشرز (رجسٹرڈ)

بٹہ مالو سرینگر

Title	:	**Ehsas Wa Idrak**
Author	:	**Dr. Bashir Ahmad Nahwi**
Price	:	Rs 350/
Publisher	:	**Meezan Publishers**

Opp. Fire & Emergency Services
Headquarters, Batamaloo, Srinagar
Pho: 2470851, Fax : 0194-2457215

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اردو زبان و ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کی حیثیت میں اخبار و جرائد کے لیے گذشتہ تیس برسوں سے مضامین مقالات یا انشایئے تحریر کرنا میرے روز و شب کے مشاغل میں شامل ہے۔ یہ مضامین و مقالات ادبی، علمی، دینی اور ثقافتی مسائل کا احاطہ کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے اور اس کوشش کے پسِ منظر میں ادب کو زندگی کے ساتھ مربوط کرنے، اسے انسانی خدمت کا وسیلہ بنانے اور قاری کے لیے کھرے اور کھوٹے کے درمیان فرق کرنے کی ایک سعی ہوتی ہے۔ میں نے گذشتہ تین دہائیوں میں ریڈیو۔ ٹی۔وی، اخبارات اور رسائل کے لیے لاتعداد مضامین انشایئے اور ریڈیائی تقاریر تحریر کی ہیں، اور بحمد اللہ عوام و خواص نے ان کو ہمیشہ بہ نظرِ استحسان پڑھا اور سنا ہے، چنانچہ ریاست کے کثیر الاشاعت اردو روزنامہ ''کشمیر عظمیٰ'' میں راقم کی تحریرات قبول عام حاصل کرچکی ہیں۔

''احساس و ادراک'' اقبال کے فکر و نظر اور دیگر سماجی و ثقافتی مضامین کا انتخاب ہے۔ ان مضامین کو سپردِ قلم کرنے کے پیش نظر صرف ایک جذبہ کارفرما ہے کہ جس معاشرے کا میں ایک فرد ہوں، اسکی ہمہ جہت ترقی، خوشحالی اور وسعت و کشادگی میں میرا اپنا حصہ ادا ہو اور جو تعلیم و تعلّم کا پیشہ ہم نے اختیار کیا ہے، اس کے ساتھ ہر مرحلے پر انصاف ہو۔ اس مجموعۂ مضامین میں کہیں کمپوزنگ کے دوران یا میری کم مائیگی کے سبب کمی یا کوتاہی قارئین کو نظر آجائے، اس کی نشاندہی کی جائے۔

بشیر احمد نحوی

۲۰ جنوری ۲۰۱۲ء

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

(اقبالؒ)

علامہ اقبالؒ......شیدائی مدینہ

عالمِ اسلام کے ہر با ایمان کے قلب وجگر کی دھڑکنیں اس نُورانی شہر سے وابستہ ہیں، جو شہر اللہ کے آخری پیغمبر جنابِ رحمۃٌ للعلمین ﷺ کی قرارگاہ ہونے کا شرف واعزاز رکھتا ہے، اور جو مدینہ منورہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ حج اور عمرہ کے مواقع پر آج تک لاتعداد مسلمان درودوسلام اور اَشک وآہ کی سوغات لے کر حرمِ کعبہ اور حرم نبویؐ کی طرف رختِ سفر باندھتے چلے آئے ہیں۔ ہماری ریاست کا ایک درویش صفت شاعر جناب شوریدہ کاشمیری مرحوم سمندری جہاز میں نوروسرور کے اس سفر کا منظر یوں کھینچتا ہے

مکاں سے خدا کے مکاں رہا ہوں
میں مجذوب دارُالاماں جا رہا ہوں
جہاں نور برسے جہاں طُور تر سے
جہاں اور ہی ہے وہاں جا رہا ہوں
بُلاوا ہے حق اور محبوبؐ حق کا
دِلا! میں کہاں سے کہاں جا رہا ہوں

عامۃ المسلمین کی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ عقیدت اور شہرِ بطحٰی کے ساتھ گہری نسبت مسلّمہ ہے لیکن اُمتِ اسلامیہ کے اکابرین اور خواص کے تعلقِ خاطر کی ہزاروں مثالیں بھی تاریخ کے صفحات پر درج ہیں۔ امام مالکؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ

مدینۂ پاک کے شہر میں کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''کیا میں اس شہر کی مٹی کو اپنے گھوڑے کے سُموں سے آلودہ کروں، جس مٹی کے اوپر سرورِ کائناتؐ قدم فرماتے تھے''۔ بقولِ اقبال

؎ خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبرؐ است

(مدینے کی مٹی دونوں دنیا سے زیادہ بہتر ہے۔ اے وہ شہر جہاں محبوب ﷺ آرام فرما ہے)

اکابرینِ امّت میں اقبال ایک ایسی باکمال شخصیت ہیں جس کے جسم و جاں اور رُواں رُواں میں رسولِ عربیؐ سے عشق و رقّت کا جذبہ موجزن تھا۔ وہ مولانا جامؔی کے اس خیال کی جا بجا تائید کرتے ہیں، جہاں جامؔی رسول پاکؐ کی مدح و ثنا میں کہتے ہیں'' کائنات کی کتاب کا دیباچہ یا سرنامہ آپؐ کی ذات ہے۔ جملہ عالم کی حیثیت غلاموں کی ہے اور آپ آقا ہیں۔

؎ نسخۂ کونین را دیباچہ اوست
جملہ عالم بندگاں و خواجہؐ اوست

اردو اور فارسی ادب کے طلبہ اور اساتذہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ عشق کا لفظ اردو اور فارسی شاعروں نے عموماً مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ غزل جسے اردو شاعری کی روح، عطر اور آبرو کہا گیا ہے، صدیوں تک گل و بلبل، حسنِ نسواں اور زلف و خال کی حد بندیوں تک محدود ہوتی رہی۔ اقبال اردو اور فارسی کا وہ واحد شاعر ہے جس نے غزل کی اصطلاح کا معنی و مفہوم، مزاج و منہاج اور حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ شاعری میں نئی پیکر تراشی اور ترکیب سازی کا ایک نیا نظامِ فن وجود میں لایا۔

؎ میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اقبال نے اردو میں بیانوے مقامات پر ''عشق'' اور ''عاشق'' اور فارسی میں دوسوتیں اشعار میں یہ ''اصطلاحات'' ایمان ویقین' عرفان وآگہی' تعلق وانسلاک' کاملِ اعتماد' للّٰہیت اور رسولِ خداؐ کے ساتھ گہری محبت کے معنوں میں استعمال کی ہیں۔ وفااور محبت کی اصطلاحیں بھی متعدد مقامات پر استعمال ہوئی ہیں۔ ان کے نزدیک جب عشق یعنی ایمان باللہ انسان کوخود آگاہی یا عرفانِ نفس کے آداب سکھاتا ہےتو نتیجۃً غلاموں پر شہنشاہی اور اقتدارِ ارض وسما کے اسرارومعارف کھول دیے جاتے ہیں۔ اقبال کے خیال میں عشق جب اپنی کامل شکل وصورت اختیار کر لیتا ہےتو اس میں عصرِ رواں کے علاوہ ایسے اوقات اور زمانے سمٹ جاتے ہیں' جو انسانی فہم وادراک سے ماوراہیں۔

؎ عشق کی تقویم میں ' عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

عشق کے وسیع تناظرات اور اَبعاد و جہات میں اقبال نے عشقِ مصطفٰےؐ کی ترکیب کومختلف مواقع پر نئے معانی میں استعمال کیا ہے۔ ایک شخص کسی خیال' نظریے یا شخصیت کے ساتھ تعلقِ خاطر پیدا کرتا ہے جبکہ ایک اور شخص کا اسی نظریے یا شخصیت کے ساتھ بھی ویسا ہی تعلق ہوتا ہے' لیکن موخر الذکر کے تعلق میں ایک کیفیت ہوتی ہے۔ رِقّت اور گریہ وزاری کی حالت ہوتی ہے' بے پناہ عقیدت کا عالم ہوتا ہے' بار بار اس شخصیت کا ذکر ہوتا ہے' اور پھر صورت یہ ہوجاتی ہے کہ وہ اس شخصیت کی وسعتوں میں گم ہوکر رہ جاتا ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تنم شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری
(خسرو)

شاعرِ مشرق کے پورے نظامِ فکر پر گہری نظر ڈالنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے عظیم نظریات و شخصیات کا جہاں عمدہ زبان میں ذکر کرتے ہیں اور ان نظریات کے داعیوں کو ان کی عظیم خدمات پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں وہاں اقبال شخصیاتِ عالم کی کہکشاں میں پیغمبر اُمّی لقب ﷺ کو ان کے آفاقی، اخلاقی، انسانی اور عمرانی قدروں کی بھرپور آبیاری کرنے کے تناظر میں اپنے قلب و جگر کا سوز و گداز پیش کرتے ہیں۔ اقبال کی بڑی تمنا تھی کہ وہ روضۂ رسولؐ پر حاضر ہو جاتے، لیکن احساسِ ندامت، لذتِ ہجر اور یہ اندیشہ کہ وہ مدینے کی کسی گلی میں اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتے اور پھر مسلسل صحت کی خرابی انہیں زیارتِ حرمین سے روکتی رہی۔ وہ اگر زیارتِ مدینہ سے فیضیاب ہوئے ہوتے، شاید عالم اسلام میں اس سے بہتر کوئی سفرنامہ حجاز نہ ہوتا جو ان کے قلم سے معرضِ وجود میں آ جاتا۔ پھر بھی انہوں نے ایک خیالی سفرنامہ ارمغانِ حجاز (فارسی) کی شکل میں تحریر کر کے آقائے مدینہ ﷺ کی خدمت میں اپنے قلب و ذہن کی دھڑکنوں کا نقشہ اور تحفہ حروف و الفاظ کی صورت میں کھینچتا ہے۔

فقیر وحید الدین نے "روزگارِ فقیر" کی جلد اول میں لکھا ہے کہ ایک بار فلسفہ کے چند طالب علم اقبال سے تبادلۂ خیال کرنے اور علمی معلومات حاصل کرنے ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوئے اور ڈاکٹر صاحب سے یہ پوچھا کہ "ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ آنحضرتؐ جب چلتے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے۔ ہمیں یقین ہے کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ لیکن ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا نبیؐ تو انسانیت کے لیے نمونہ ہے اگر قدرت

کے مظاہر نبیؐ کے لیے مختلف ہوں اور ہمارے لیے مختلف تو پھر نبیؐ تو نمونہ نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹر صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔ تم بالکل سچ کہتے ہو۔ کہ حضرت عمرؓ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ بات یہ ہے کہ یہ واقع پڑھ کر تمہارا ذہن مختلف راستے پر منتقل ہو گیا ہے۔ تم الجھ کے رہ گئے ہو قدرت کے مظاہر اور درختوں کے الجھنے میں۔ بھائی یہ واقعہ تو صرف عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ انکی آنکھ یہ دیکھتی تھی کہ درخت جھک رہے ہیں۔ اس کا درختوں کے جھکنے کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں۔ اگر تمہیں عمرؓ کی آنکھ نصیب ہو تو تم بھی دیکھو گے کہ دنیا ان کے سامنے جھک رہی ہے''

اسلام اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ کی تعلیمات پر گفتگو یا اظہار رائے کرنا ہمارے جدید مسلم تعلیم یافتہ طبقہ پر کبھی کبھار گراں گذرتا ہے۔ اقبال پہلے یورپ کے فارغ التحصیل تھے، جنہوں نے جدید علوم سے آراستہ مسلم نوجوانوں کو اس بات کی تحریک دی کہ وہ بلا جھجک اپنی علمی گفتگو یا تحریر و تقریر میں بغیر کسی مصلحت کے پوری جرأت کے ساتھ اسلام کی آفاقیت اور اپنے عظیم پیغمبرؐ کی عظمت و جلالت کا ذکر کیا کریں۔ چنانچہ چوہدری نبی احمد اسسٹنٹ سیکرٹری لیجیسلیٹو اسمبلی مغربی پاکستان نے ایک موقعہ پر کہا تھا۔ کہ ''اقبال کا یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے جسے ہم زندگی کے آخری لمحہ تک فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ اقبال نے ہم میں روباہی کی جگہ اسد اللٰہی پیدا کی''۔

ارمغان حجاز (فارسی) اقبال کے اس فکری و تخیلاتی سفر کی شاندار شعری و وجدانی کیفیت کا ایک شاہکار ہے جسکو مدّاحِ رسولؐ نے محبت و تقدیس کے چشمۂ صافی میں ڈال کر بارگاہِ نبوت و رسالت میں انتہائی عاجزی و انکساری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں درِ دوستؐ پر پڑے گرد و غبار کو پلکوں سے صاف کرنے کی آرزو بھی ہے، سرزمین حجاز کی گرم ریت پر سجدہ ریز ہونے کی تمنا بھی ہے، وصالِ محبوب کی بے تابی کا مظاہرہ بھی ہے، اور راہِ مصطفےٰؐ پر گامزن ہونے کی تاکید بھی ہے۔ ارمغان حجاز کا ایک ایک لفظ، ایک ایک بند اور اس کے جملہ عنوانات

میں مضمر جذبات و احساسات، اقبال کے باطن کی خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار ہیں۔

گر چہ کشتِ عمرِ من بے حاصل است
چیز کے دارم کی نامِ او دل است
دارمش پوشیدہ از چشمِ جہاں
کز سُمِ شبدیزِ تو دارد نشاں
دل بہ محبوبؐ حجازی بستہ ایم
زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم

ترجمہ:- میری عمر کی کھیتی اگر چہ لا حاصل ہی رہی، لیکن ایک چھوٹی سی چیز رکھتا ہوں جس کا نام "دل" ہے۔ اس دل کو دنیا کی آنکھوں سے چھپاتا ہوں، کیونکہ (اے پیارے نبیؐ) اس پر آپ کے قیمتی گھوڑے کے سموں کا نشان پڑا ہے۔ ہم نے اپنے دل کو محبوب حجازیؐ کے ساتھ جوڑ رکھا ہے اور اس جانب ہم ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ ہیں۔ (یعنی حبِ نبیؐ ہم سب کی پہچان ہونی چاہیئے)

اوپر کے یہ اشعار شیدائی نبوتؐ کے شدید جذبے کی نشاندہی کرتے ہیں، جو جذبہ ان کے تیس ہزار اشعار میں سیکڑوں مراحل اور مقامات پر متلاطم ہے۔ ارمغانِ حجاز تین سو باون قطعات کا ایسا مرقع ہے جس میں شاعر مشرق عقیدت کی پوری تابانی اور رعنائی کے ساتھ ایک شاہکار تخیلی سفر نامہ خلق کرتا ہے۔ اقبال نے ایک موقعہ پر اللہ کے حضور یہ استدعا کی ہے

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روزِ محشر عذر ہائے من پذیر

در حسابم را تو بینی نا گزیر
از نگاهِ مصطفیؐ پنہاں بگیر

ترجمہ:-اے خدا تو دو دنیا سے بے نیاز ہے اور میں ایک فقیر ہوں۔ قیامت کے دن میری کوتاہیوں اور حیلے بہانوں سے صرفِ نظر کرنا اور اگر میرا حساب لینا تو لازمی سمجھے گا، تو میرا حساب کتاب محمد مصطفیٰؐ کی نظروں سے چھپ کے لے لینا۔

یہ رباعی احترام رسولؐ کی انتہا ہے۔ چنانچہ تبلیغی جماعت کے ایک بہت بڑے بزرگ نے اس رباعی کو پڑھ کے کہا تھا کہ ''قیامت کے دن اسی ایک رباعی سے اقبالؒ کی مغفرت ہوگی''۔

اقبال بار بار اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ شاعری کے فن سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے ایک دوست کو خط میں لکھا تھا۔ ''میں نے اپنے آپ کو کبھی شاعر نہیں سمجھا۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا''۔ اقبال کے نظامِ فکر و نظر پر گہری نگاہ ڈالنے کے بعد اس امر کا بھرپور احساس ہوتا ہے کہ انکی شاعری کا بنیادی مرکز و محور محبتِ الٰہی اور عشق مصطفویؐ ہے۔ اس عشق کی بدولت وہ مسلمانوں کی خفتہ و تاریک زندگی میں بیداری اور روشنی کے فانوس جلانا چاہتے تھے۔

؎ می نہ دانی عشق و مستی از کجا ست
ایں شعاعِ آفتابِ مصطفیٰؐ است
دل ز عشق اوؐ توانا می شود
خاک ہمدوشِ ثریا می شود

اقبال کے عشقِ آقائے مدینہؐ کے ہزاروں واقعات، سینکڑوں اشعار، درجنوں ملفوظات اور

ان کی آنکھوں سے ٹپکے لاکھوں گہر ہائے تابدار کو کیسے ایک مختصر مضمون میں سمیٹا جائے، یہاں انکی محبتِ رسولؐ میں ڈوبی ہوئی مشہور نظم ''ذوق وشوق'' کے وہ نعتیہ اشعار قلمبند کیے جاتے ہیں، جن سے ملتِ اسلامیہ کے اس عظیم دردمند، حبِ رسولؐ کے داعی اور ملت کے شاندار مستقبل کے حدی خوان کی داخلی کیفیات کا اندازہ ہوتا ہے

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
شوکتِ سنجرؔ و سلیمؔ تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؔ و بایزیدؔ تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پاگئے
عقل، غیاب و جستجو عشق، حضور و اضطراب

☆☆☆
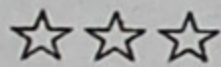
خاندانِ نبوّت کا مرتبہ ومقام

اور اقبالؒ کا فکری نظام

مذاہبِ عالم کے تفصیلی مطالعے سے اس بات کی صاف صاف لفظوں میں عکاّسی ہوتی ہے کہ انبیأ کرام جو کرۂ زمین کے مختلف خطّوں اور حصّوں میں مبعوث ہوئے ہیں ان کے خاندان اور ان خاندانوں سے وابستہ باایمان اور رسالت و آخرت پر یقین رکھنے والے عوام وخواص کی عقیدتوں اور ارادت مندیوں کے مرکز ومحور بنے رہے۔ بذاتِ خود انبیا ورسل کا وجود قابلِ احترام تو تھا ہی، لیکن ان کے کسی عزیز ورفیق کا نام بھی تاریخ میں بڑی عزت وتوقیر سے محفوظ ہے۔

آقائے دوجہاںؐ کی ذاتِ اقدس عظمت وجلالت کا وہ مقام ہے جسکی تقدیس وتوقیر کے حدود اللہ تعالیٰ نے خود متعین کئے ہیں، اور تا قیامِ قیامت آپکی ذات مسلمانانِ عالم کے لیے اسوۂ حسنہ اور طریقۂ کاملہ بن کر رہے گی ۔آپ کا خاندان پوری ملتِ اسلامیہ کے لئے مقدس ومحترم ہے۔ آپکی ازواج مطہرات کو امّہات المومنین یعنی مومنوں کی ماؤں کا مرتبہ ومقام حاصل ہے، چنانچہ آپکی اولاد پر درود وسلام عرض کرنا مسلمانوں کے لیے ایک اہم تحفہ اور عبادت قرار دیا گیا ہے۔ آلِ نبیؐ کی مدح وتوصیف میں آج تک ہزاروں عالموں اور شاعروں نے عقیدت واحترام کے جملہ لوازمات کے ساتھ گل ہائے محبت ومودّت پیش کئے

ہیں لیکن اقبال خاندانِ رسالت کے اہم ترین فرزند شہید کربلا حضرت امام حسینؓ کی شہادت کو ایک دوسرے ہی نقطۂ نگاہ سے پیش کر چکے ہیں۔ شاعرِ مشرق مدّاح رسولؐ علامہ اقبال کے نزدیک اگرچہ ہر قسم کی موت ایک مومن کے لیے مرغوب و شیرین ہے لیکن فرزندِ جنابِ علی مرتضیٰؓ کی موت ایک منفرد موت ہے۔ جس کے پسِ منظر میں حق و باطل کی ایک داستان مضمر ہے۔

گر چہ ہر مرگ است برمومن شکر
مرگِ پور مرتضیٰؓ چیزے دگر

تاریخ انسانی ہر عہد میں مختلف اقسام کی موت کا اندراج کرتی آئی ہے۔ ایسے بھی انسان مر گئے، جن کی وفات پر کوئی آنکھ رونے کے لئے موجود نہیں تھی، پھر اس قسم کے لوگ بھی رحلت کر گئے، جن کے بارے میں کہا گیا ''خس کم جہاں پاک'' گندگی ختم ہوئی دنیا صاف و پاک ہوگئی۔ ایسے لوگوں کی موت سے لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہٹلر، ہلاکو، اور چنگیز کا نام سن کر لوگ انہیں آج بھی برے لفظوں سے یاد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نام، بھی تاریخ کے صفحات پر سنہرے حروف میں رقم ہیں جنہوں نے صداقت، خیر، حسن، انصاف اور انسانی اقدار کی عظمت کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ کاروانِ حریت و شہادت کے انہی سرفروشوں میں سیدّنا حضرت امام حسینؓ اپنی جواں مردی، ایثار اور جذبۂ قیامِ خلافت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ علامہ اقبال کے خیال میں اگر حضرت حسینؓ کا عراق جانا حصولِ اقتدار کے لیے راہ ہموار کرنا ہوتا تو وہ ایک چھوٹے سے قافلے جو بہتر نفوس پر مشتمل تھا سفر نہ کرتے، بلکہ اپنے ساتھ اپنے عظیم نانا کے لاکھوں ماننے والوں کی حمایت حاصل کر کے یزیدی سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیتے۔ ان کا سفر عراق فقط اِتمام حجت قائم کر

نے اور بنوامیہ کے سرپھرے فرمانرواؤں پر خلافت اور بیعت کی حقیقت واضح کرنے کے لئے تھا، انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اقتدار کے نشے میں سرمست ''خلیفہ'' خاندانِ رسالت کے قتلِ عام کا مرتکب ہوگا اور مستقبل میں اس کے نتائج کا اندازہ لگائے بغیر اپنے عمالوں کو داؤ پیچ کھیلنے کی اجازت دے گا۔ علامہ اقبال کے نزدیک جب خلافت نے اپنا رشتہ قرآن پاک سے توڑ دیا، اور حریتِ فکر کا گلا گھونٹ دیا تب جا کے حضرت حسینؓ معرکہ آرا ہوئے۔

اقبال نے اپنی مشہور فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں ''در معنی حریتِ اسلامیہ وسرِّ حادثۂ کربلا کے عنوان سے ۳۹ اشعار پر طویل تاریخی نظم تحریر کی ہے۔ نظم کے اشعار شہدائے کربلا کے ساتھ ایک عاشقِ رسولؐ کی جذباتی وفکری کیفیات کے آئینہ دار ہیں۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں عشق وعقل کا ایک عالمانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہ حضرت حسینؓ کو عشق، ایمان، اور یقین کی علامت مانتے ہوئے اس کے برخلاف یزید کو عقل، مادیت، ہوس اور سفا کی کا نمائندہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں عشق وعقل کے درمیان اسی قسم کی معرکہ آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ کبھی عقل اپنے مکروہ ارادوں سے بظاہر غالب آگئی اور عشق وقتی طور پر ناکام ہوگیا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ بہر حال حق ہمیشہ سربلند رہتا ہے اور مادی عقل کے پجاری دنیا میں بھی اور آخرت میں نامراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال معرکۂ کربلا کو کس زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اسکی ان کے درجنوں اُردو اشعار میں وضاحت ملتی ہے، لیکن وجدانی اور جذباتی اسلوب بیان کا اظہار مذکورہ نظم میں ملتا ہے۔ فارسی سے نابلد قارئین کی دلچسپی کے لیے نظم کے چند چیدہ چیدہ اشعار یہاں ترجمے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں تا کہ واقعۂ کربلا کا ایک متوازن نظریہ سامنے آجائے، اور ہمارے کچھ بھائیوں نے جس مبالغہ آمیز انداز میں واقعے کو پیش کرنے کی

کوشش کی ہے، وہ بھی صحیح بات سمجھنے کی کوشش کریں۔

آں شنیداستی کہ ہنگام نبرد
عشق با عقلِ ہوس پرور چہ کرد

ترجمہ:۔کیا تونے سنا ہے کہ میدان جنگ (کربلا) میں عشق نے ہوس پرور عقل (یزیدیت) کے ساتھ کیا کیا۔

آں امامِ عاشقان پورِ بتولؓ
سروِ آزادے زبُستانِ رسولؐ

ترجمہ:۔وہ عاشقوں کا رہنما حضرت فاطمۃ الزہراؓ کا فرزند اور رسول اکرمؐ کے گلستان کا آزاد سرو۔

بہر آں شہزادۂ خیرا لملل
دوشِ ختم المرسلیں نعم الجمل

ترجمہ:۔مسلمانوں کے اس شہزادے کے لیے نبی پاکؐ کے دوشِ مبارک بہترین سواری تھے۔

درمیانِ امت آں کیواں جناب
ہمچو حرف قُل ھواللہ درکتاب

وہ آسمان جیسی بلندی والے (حضرت حسینؓ) امتِ مسلمہ کے درمیان وہی مقام رکھتے ہیں جیسے قرآن پاک میں سورۂ اخلاص کو حاصل ہے۔

موسیٰؑ و فرعون وشبیرؓ ویزید
ایں دو قوت ازحیات آید پدید

ترجمہ:۔موسیٰؑ اور فرعون، حسینؓ اور یزید یہ دونوں طاقتیں شروع سے ظہور پذیر ہوئیں۔

زندہ حق از قوتِ شبیّری است
باطل آخر داغِ حسرت میری است

ترجمہ:۔حق وصداقت حضرت حسینؓ سے زندہ ہے اور باطل کا انجام افسوس کی موت ہے۔

مدّعایش سلطنت بودی اگر
خود نہ کردی باچنیں ساماں سفر

ترجمہ:۔آپ کا (حسینؓ) کا مقصد سلطنت ہوتا تو اتنے قلیل سامان کے ساتھ سفر نہ کرتے۔

عالمِ اسلام کے اکثر وبیشتر ملکوں میں ہر سال محرم الحرام کے مہینے میں شہداءِ کربلا کی شہادت ، شجاعت اور صبر واستقامت کو یاد کیا جاتا ہے۔ ایام عاشورہ گذرنے کے بعد ان شاندار تعلیمات کو فراموش کیا جاتا ہے، جنکی خاطر جناب حسینؓ نے قربانی پیش کی تھی۔

اقبال کے نزدیک دریاے دجلہ اور فرات کا پانی اب بھی اسی انداز میں بہہ رہا ہے ،لیکن مسلمانوں کے کاروان میں حسینی کردار کا ایک بھی فرد دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اقبال دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک جدوجہد ، جہاد اور شہادت کے پیچھے خلوص ،لِلّٰہیت ، ایثار اور رضائے الٰہی کارفرما نہیں تب تک یہ عمل بے سود ہے۔اقبال کے خیال میں حسینؓ نے فقر، بے نیازی اور یکسوئی کا ایسا نمونہ دنیا کے سانے پیش کیا، کہ حق پرستوں کے لیے یہ اوصاف نشانِ راہ کا کام دیتے رہیں گے۔ وہ ایمانِ شبیری کو میراثِ مسلمان کا نام دیتے ہیں ۔ اور مقام شبیری کو حقیقتِ ابدی تصور کرتے ہیں۔

میری نوا سے ہوے زندہ عارف وعامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

حرم کے پاس کوئی اعجمی ہے زمزمہ سنج

کہ تارتار ہوئے جامہ ہائے احرامی

حقیقتِ ابدی ہے مقام شبیریؓ

بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی وشامی

اقبال کے فکری نظام میں خاندان بنوت سے وابستہ مکرّم و معظّم شخصیات کا ذکر اسلوب وانداز بدل بدل کرانکی پاکیزہ تعلیمات اور مُسلم دنیاپران کے صالح اثرات کے ساتھ آتا ہے، کبھی وہ خلیفۂ چہارم کوخیبر کشا، مرتضیٰ اورتاجدارِ ھَل اتیٰ کہکر یادکرتے ہیں اور کبھی زورِحیدری اورضرب کرّاری کواپنے لیے کافی سمجھتے ہیں۔

؎ مرے لیے ہے فقط زور حیدریؓ کافی

ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

مری نظر میں یہی ہے جمالِ زیبائی

کہ سربسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اقبال خانقاہوں کے روحانی اور ایمانی اثرات کا بارہا اپنے خطوط اورنجی محفلوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے اور انکی افادیت سے انکار نہیں کر سکتے تھے، لیکن خانقاہی نظام سے جب مسلمانوں کے اندر گوشہ نشینی، تنہائی، تعطّل اور رہبانیت کے انداز پیدا ہوتے رہے تو انہوں نے اس کے خلاف اپنا ردّعمل ظاہر کیا۔ وہ اعلیٰ مقاصد اور مقدس تعلیمات کو عام کرنے اور ظلم کے خلاف سراپا احتجاج بننے کے لئے خاندانِ نبوت کے چشم و چراغ حضرت حسینؓ کو بطورِ نمونہ پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری
ترے دین وادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالمِ پیری

اقبال خانوادۂ رسالت کی قابلِ تعظیم خاتون حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؓ کے سیرت وکردار کو مسلم امت کی خواتین کے لئے ایک کامل نمونہ بتاتے ہوئے انکی مدح میں اپنی طرف سے احترام، توقیر، تقدیس اور تعظیم کے جملہ الفاظ وآداب کو اشعار میں ڈھال چکے ہیں ۔وہ سیدہ فاطمہؓ کو صبر ورضا کے ماحول کی پروردہ، اور امت کی ماؤں کے لیے انہیں اسوۂ کاملہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرطِ عقیدت اور نبی عربیؐ کے جسدِ انور سے جناب فاطمہؓ کی نسبت کے سبب اقبال فرماتے ہیں

رشتہ آئین حق زنجیرِ پاست
پاسِ فرمانِ جنابِ مصطفیٰؐ است
ورنہ گردِ تربتش گردید مے
سجدہ ہا برخاکِ اُو پاشید مے

ترجمہ:۔ اللہ کے آئین کا رشتہ میرے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا ہے اور مجھے محمد مصطفیٰؐ کے احکامات کا احترام ہے۔ ورنہ میں اپکی قبر کے گرد طواف کرتا اور کئی سجدے اس مٹی پر نچھاور کرتا ۔(چونکہ طواف کعبہ کے لیے اور سجدہ خدا کے لئے مخصوص ہے، اس لیے ایسا نہیں کرسکتا ہوں)

☆☆☆

فکرِ اقبال اور ذکرِ ابراہیم علیہ اسلام
(فارسی کلام کی روشنی میں)

اقبال کے نظامِ فکر پر تاریخ ساز شخصیات کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ یہ شخصیات دنیا کے مختلف خطوں، تہذیبوں اور مذاہب سے وابستہ رہی ہیں۔ تاریخی، انقلابی، اور دینی شخصیات میں ابُو الانبیاءؑ حضرت سیدنا ابراہیمؑ کے جذبۂ ایمانی، توحیدِ خالص، حق گوئی، بے باکی اور للّٰہیت کے گہرے نقوش اقبال کے نظامِ فکر پر جا بجا مرتسم ہیں۔ چار ہزار سال پہلے جناب ابراہیمؑ نے شرک وضلالت کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی، اسکی گونج ابھی تک عرب کے ریگستانوں، بیابانوں اور نخلستانوں میں سنائی دیتی ہوگی۔ آپ کی تقلید میں تمام انبیاءؑ کرام جو آپ کے بعد مبعوث ہوئے اسی لافانی کلمہ توحید کے ترجمان رہے جسکی اشاعت وترسیل نے نمرودی اقتدار کو پریشان کر کے چھوڑ دیا تھا۔ جناب ابراہیمؑ غروب ہونے والوں کو چھوڑتا ہے اور اس ابدی طاقت کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے جسکو کبھی غروب نہیں۔ جسکی نہ ابتداٗ ہے اور نہ انتہا یہی طریق کار جملہ انبیاءؑ کرام کا شعارِ حیات رہا ہے۔

تارکِ آفل براہیم خلیل
انبیاءؑ رانقشِ پائے او دلیل

ترجمہ:۔ ڈوبنے والوں کو خیر باد کہنے والا جناب ابراہیم، جن کے نقوش راہ انبیاءؑ کرام کے

لیے دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب خلیل الرحمٰنؑ کے بارے میں اقبال نے اپنے اُردو اور فارسی کلام میں متعدد مقامات پر انہیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے انکی قربانیوں اور راہِ حق میں ان کے صبر وثبات کو نہایت شاندار الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ہمارے جدید تعلیم یافتہ حضرات میں اکثر یتان کی اُردو شاعری کے حوالے سے حضرت ابراہیم کے مشن، خدمات اور ان کے جذبۂ توحید سے باخبر ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو جناب ابراہیمؑ کا سب سے زیادہ اور تفصیلی تذکرہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں کیا ہے۔ لہٰذا آج کے اس مضمون میں انکی فارسی شاعری کے تناظر میں ان افکار کا خلاصہ پیش کیا جائے گا جو انہوں نے مذکورہ عنوان کے حوالے سے ظاہر کئے ہیں۔

اپنی مشہور مثنوی اسرارِ خودی میں اقبال تصوّرِ خودی کی وضاحت کرتے ہوئے خودی کے ''مرحلہ دوم یعنی ضبطِ نفس'' کے زیرِ عنوان فرماتے ہیں کہ جب کوئی انسان لا اِلٰہ اِلٰہ اِلا اللہ کی سلطنت کا ساکن بن جاتا ہے تو وہ زن واولاد اور رشتہ و پیوند کی محبت کی سرحدوں سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی سے بھی اپنا تعلق قائم نہیں کرتا ہے اور یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کے حلق پر چھری چلانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا ہے۔ وہ یہ عمل حکم الٰہی کی کامل بجا آوری کے لیے سرانجام دیتا ہے۔

؎ ہر کہ در اِقلیم لا آباد شُد
فارغ از بندِ زن و اولاد شُد

می کند از ما سوئ قطعِ نظر

می نہد ساطور بر حلق پسر

اقبال کے خیال میں اور تاریخ بھی اسکی تائید کرتی ہے کہ مردانِ حق ہر زمانے میں ا ٓزمائشوں اور صبر آزما مرحلوں سے گزرے ہیں ۔ انِ مردان حق آ گاہ نے ہمیشہ استقلال، پامردی اور رضائے الہیٰ کی خاطر تمام امتحانات کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا ہے اور اقبال کے الفاظ میں ''صاحب قلبِ سلیم جناب ابراہیمؑ آگ کے پھول چننے میں خوشی محسوس'' کرتے نظر آتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم

زورِ خود را ازمہماتِ عظیم

عشق بادشوار و رزیدن خوش است

چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است

اقبالؒ مختلف اور متفرق نکتہ آرائیوں کا سہارا لیکر ''اسرارِ خودی'' میں ایک حکایت میں بنارس کے ایک دانشمند اور نیک صفت برہمن اور ایک مسلم پیشوا کے درمیان مکالمے کے ذریعے قوموں کو تسلسل حیات قائم رکھنے کے لیے مخصوص روایات کو محکم بنانے پر زور دیتے ہیں۔ کالم کی تنگدامنی کے سبب پورے مکالمے میں زیر بحث نکات کو یہاں نہیں لایا جا سکتا ہے، تاہم مسلم رہنما جو بات برہمن کو سمجھا رہا ہے وہ یہ کہ اے ''برہمن میں تجھ سے نہیں کہتا ہوں کہ تو بتوں سے بیزار ہو جا، اے برہمن تو پرانی تہذیب کا امانت دار ہے لیکن تو (موجودہ حالات) اپنی کافری کے عمل میں مکمل نہیں، اور نہ تو اپنے دل کے مرکز کی گردش کی طرف متوجہ نہیں۔ میں تو تسلیم ورضا (اسلام) کے راستے

دور پڑ گیا، تو آزر سے اور میں ابراہیمؑ سے دور ہوں ۔اس حکایت کے تاریخی اور سماجی اور عصری پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

من نگویم از بتاں بیزار شو
کافری؟ شائستہ زنّار شو
اے امانت دارِ تہذیبِ کہن
پشتِ پا بر مسلکِ آبا مزن
تو کہ ہم درکافری کامل نہٕ
درخورِ طوفِ حریمِ دل نہٕ
ماندہ ایم از جادۂ تسلیم دور
تو ز آزر من ز ابراہیم دور

''اسرارِ خودی'' میں اقبال ملّتِ اسلامیہ کے اساسی ارکان میں ''رُکن توحید'' کی اہمیت، طاقت اور معنویت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مسلمان دنیا میں سرفراز اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ ''توحید مست'' ہو جاتا ہے اور جب خدائے لاشریک کی وحدانیت کا تصور اس کے قلب وذہن پر غالب آجاتا ہے تو وہ ہر قسم کی غلامی اور بندگی سے آزاد ہو جاتا ہے۔اپنے آپ کو نسل خلیل سے منسلک کرتے ہوئے قرآنی آیت سے اس کا استدلال کرتے ہیں۔

؎ گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر
نیست ممکن ایں چنیں اندازِ فکر

ما مسلمانیم و اولادِ خلیل

از اَبِتیکُم گیر از خواہی دلیل

مغرب اپنی تمام تر سائنسی اور مشینی ترقی کے باوجود اقبال کی نظر میں اس کے داخلی بحران اور روحانی قدروں سے محرومی کے سبب باعثِ تنقید رہا ہے۔ ان کے خیال میں یورپ علم و ہنر کی روشنی سے یقیناً مالا مال ہے لیکن اس کے ظلمات میں آبِ حیات کا چشمہ کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ ''میخانۂ مغرب'' کے عنوان سے تحریر کردہ نظم میں وہ ان ایام کا تذکرہ کرتے ہیں جب وہ یورپ میں تھے، اور یورپ کی جملہ رنگینیوں کے باوجود اس کے جلوے ''بے کلیم'' اور اس کے شعلے ''بے خلیل'' دکھائی دیتے تھے۔ کیونکہ بے پروا عقل، انساعِ عشق کو لوٹتی ہے۔

جلوۂ او بے کلیمؑ شعلۂ او بے خلیلؑ

عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گراست

در ہوایش گرمیٔ یک آہِ بے تابانہ نیست

رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست

اقبال نے ۴۸ مقامات پر لفظِ ابراہیمؑ کو ایمان و یقین کی سب سے طاقتور علامت، انبیاؑ کرام کی مقدس جماعت کے ممتاز اسمِ گرامی اور حق و صداقت کے بے مثال علمبردار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک جناب ابراہیمؑ تمام زمانوں اور دنیا کے تمام خطوں میں رہنے والے راہِ حق کے مسافروں اور باطل قوتوں کے ساتھ برسرِ پیکار حق پرستوں کے لیے حوصلے، ہمت، عزیمت اور رہنمائی کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

درگذر مثلِ کلیم از رودِ نیل
سوئے آتش گامزن مثلِ خلیلؑ
نغمۂ مردے کہ دارد بوے دوست
ملتے را می برد تا کوے دوست

حضرت سید علی ہمدانیؒ کے حضور میں
شاعرِ مشرق علاّمہ اقبالؒ

اَرض کشمیر کے مُحسنوں، خیر خواہوں، اور دینی پیشواؤں کی سیرت و تاریخ پر جب ہم ایک نظر ڈالتے ہیں تو ہماری گردنیں ایک عظیم المرتبت شخصیت کے سامنے عقیدت و احترام سے جھک جاتی ہیں، جن کا اِسمِ گرامی جناب میر سید علی ہمدانیؒ ہے۔ خِطۂ کشمیر جب تک کرۂ زمین پر قائم ہے، تب تک کشمیریوں کے لیے یہ نام حرزِ جاں بن کر رہے گا، اور اس بلند پایہ انقلابی اور روحانی قدروں کے علمبردار کے پیغامِ توحید و سنّت سے مسلمانانِ کشمیر قوت، حرکت، حرارت، روشنی اور ایمان کی حلاوت محسوس کرتے رہیں گے۔ آپ کی کشمیر میں تشریف آوری سے پہلے حضرت سید عبدالرحمان بلبلؒ اور دیگر بزرگوں نے تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی شروعات کی تھی، لیکن جناب شاہِ ہمدانؒ اور ان کے فرزند حضرت میر محمد ہمدانیؒ نے مسلکی اختلافات سے بالاتر ہوکر تبلیغ کا فریضہ منظّم اور مربوط انداز میں پیش کیا۔ جناب امیرؒ نے تالیف و تصنیف اور وعظ و تبلیغ کے ذرائع کو استعمال میں لاکر خدمتِ دین کے جذبے کے تحت لمبے سفر اختیار کئے چنانچہ کشمیر سے واپسی کے سفر میں ہی آپ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

آپ کی عظیم الشان تعلیمات کا احاطہ اس وقت آسانی سے کیا جاسکتا ہے، جب ہم آپکی تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق جناب امیر نے ایک سوستّر چھوٹی بڑی کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں بیشتر چھوٹے رسائل پر مشتمل ہیں۔ رسالۂ نُوریہ، رسالۂ

مکتوبات، اَورادِ فتحیہ، ہمدانیہ، مکتوباتِ امیریہ رسالہَ داوَدیہ مکارِم اَخلاق، کشفُ الحقائق، مشارُب الاذواق، رسالہَ درویشیہ، ذخیرۃُ الملوک، چہل اسرار، اور حَلُ الفصوص، چند قابلِ ذکر تخلیقی اور رشد و ہدایت سے بھرپور تصانیف ہیں، جن کے موضوعات، مضامین اور افکار و نظریات سے اہل علم ودانش واقف ہیں۔

حضرت امیر کبیرؒ کی ان تصانیف میں ذخیرۃُ الملوک، چہل اسرار اور اورادِ فتحیہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ چہلِ اسرار غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ان غزلوں کے بارے مشہور ہے کہ آپ اپنے چالیس ارادت مندوں کے گھروں میں ایک ہی وقت تشریف لے گئے اور ہر گھر میں کچھ تناول فرما کر ایک ایک غزل بطور یادگار عنایت فرمائی تھی۔ ان غزلوں میں اسلامی تصوف وطریقت، اسرار ومعرفت اور شریعت کے حقائق کی شاعرانہ انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ اورادِ فتحیہ کا نسخہَ کیمیا آپ نے کشمیریوں کو بطور وظیفہ دیا تھا، اور اس میں اللہ کی ربوبیت، اسلام کی حقانیت، رسول پاکؐ کی نبوت و رسالت، قرآن کی عظمت و امامت، کعبۃ اللہ کی جلالت، نماز کی فرضیت اور مومنوں کے مابین محبت واخوت پر ضرور دیا ہے۔ آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کشمیر کے ہر گھر میں اس وظیفے کا ورد بڑی عقیدت، اِخلاص، اور سادگی کے ساتھ ہوا کرتا تھا لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اب تبلیغ دین، دینداری اور اشاعت وترسیل کے انداز بدل گئے اور کچھ نرے احمقوں کے نزدیک اوراد و وظائف کی کوئی اہمیت نہ رہی۔

حضرت امیر نے اپنی تعلیمات کی تفصیل اپنی ایک تصنیف رسالہَ دہ قاعدہ میں بیان کی ہے، اور اپنے معتقدین کو تزکیہَ نفس، تصفیہَ باطن، تعلق باللہ، اذکار وعبادات اور مراقبہَ وتلاوت پر کاربند رہنے کی تلقین کی ہے۔ آپ اپنے بیانات میں خشم، بخل، لالچ، کبر، نخوت، پندار، عُجب اور شہوت کو اخلاقی رذائل میں گردانتے ہیں اور بہر صورت ان سے اجتناب کرنے پر زور دیتے ہیں۔

ذخیرۃُ الملوک میں جناب سید علی ہمدانیؒ نے دس ابواب میں اپنی تمام تر تعلیمات کا خُلاصہ بیان فرمایا ہے۔ یہ کتاب دراصل سلاطین وملوک کو آدابِ زندگی سے آشنا کرنے کا ایک ذریعہ بھی ہے اور معلومات کا ایک ذخیرہ بھی ہے۔ اس کتاب سے صرف حکمران ہی نہیں، عوام الناس بھی اپنے لیے ہدایت وسعادت کے موتی سمیٹ سکتے ہیں۔

اسلام کے ان مخلص مبلّغوں کی بے لوث کوششوں کی بدولت ہی پوری دنیا میں شمع ہدایت اب بھی فروزاں ہے اور لوگ صدیاں گذرنے کے باوجود انہیں ادب واحترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ ہماری مُسلم دانشوری اور ادب وشاعری میں علامہ اقبال کو اپنی متصوّفانہ اور مومنانہ آئیڈیالوجی کے اعتبار سے پوری دنیا میں ایک منفرد مقام حاصل ہو چکا ہے۔ ویب سائٹ پر ان کی حیات، شخصیت، کارناموں اور ان پر تحریر کی گئی ہزاروں کتابوں کا مواد دنیا کے اربابِ دانش کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے اور رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں ''اقبال کا کلام یقیناً اس صدی کا علم الکلام ہے''۔

دانشور اقبال نے مختلف مذاہب کے پیشواؤں اور رہنماؤں کو بھرپور نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، لیکن ملتِ اسلامیہ کے جن نفوسِ قدسیہ کو انہوں نے گل ہائے عقیدت نچھاور کیے ہیں ان میں حضرت میر سید علی ہمدانیؒ ایک ممتاز حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ جاوید نامہ اقبال کے فکری ریاض کا ایک ایسا شاہکار ہے، جس کے بارے میں اسلم جیراجپوری نے ایک بار کہا تھا۔ ''ہم سنا کرتے تھے کہ فارسی ادبیاتِ عالیہ میں صرف چار کتابیں ہیں۔ شاہ نامہ فردوسی، مثنوی مولانا رومؒ، گلستانِ سعدیؒ اور دیوانِ حافظ۔ مگر جاوید نامہ اب پانچویں کتاب وجود میں آ گئی ہے۔ جو معنویت اور نافعیت کے لحاظ سے ان سب سے اچھی ہے۔ حقیقت میں یہ اس قابل ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانانِ عالم کے نصاب میں شامل کر لی جائے'' اسی معرکۃ الآرا

کتاب میں اقبال عالمِ تصور میں افلاک کی سیر پر چلے جاتے ہیں' اور پھر افلاک کی سیر کی سرگذشت مناجات' نغمہ' ملائک' تمہید زمینی' فلکِ قمر' فلک عطارد' فلکِ زہرہ وغیرہ عنوانات کے تحت پیش کرتے ہوئے ایک باب حرکت بہ جنت الفردوس قائم کرتے ہیں۔ جنت الفردوس میں آپ کو حضرت سید علی ہمدانیؒ ، ملاّ طاہر غنی سے زیارت اور ہم کلامی نصیب ہوتی ہے۔ اسی مرحلے پر اقبال یوں رقمطراز ہیں۔

''رومی کی باتوں نے میرے دل میں اثر پیدا کیا۔ میں بہشت میں یادوں کی تپش سے تڑپ اٹھا اور مجھے پرانے غم والم جنت میں یاد آئے۔ اتنے میں اس گلستان میں کوثر کے چشمے کے کنارے ایک دردمند آواز بلند ہوئی۔ آواز کیا تھی ''میں نے تنکوں کا ڈھیر جمع کیا تاکہ خود کو جلا ڈالوں۔ پھول کو گماں ہوا کہ میں گلستان میں گھونسلہ بنا رہا ہوں''۔

رومی نے کہا' میرے بیٹے جو کچھ دیکھ رہے ہو اور جو کچھ گذر گیا اس پر دل نہیں دے بیٹھو۔ یہ رنگین نوا شاعر غنیؔ ہے۔ تمہارے وطن کا شاعر ہے۔ اس کا ظاہر و باطن فقر و غنا ہے۔ یہ دنیا و مافیہا سے غنی ہے۔ وہ مستِ مدام حضرت سید والا مقام کے حضور میں نغمے الاپ رہا ہے۔ کون سید، سادات کے سید، عجم کے سالار' جن کے ہاتھ میں قوموں کی تقدیر کی تعمیر ہوئی۔ غزالی نے اللہ ہُو کا جو سبق پڑھا تھا' اس کا ذکر و فکر ان ہی کے خاندان سے جڑا ہوا ہے۔ کشمیریوں کے مرشد ہیں۔ وہ امیروں' بادشاہوں اور درویشوں کے مشیر ہیں۔ اس دریا آستین سلطان نے کشمیر کو علم' صنعت' تہذیب اور دین عطا کیا۔ اس مردِ حق پرست نے ایک چھوٹا ایران پیدا کیا۔ دل پذیر، فائدہ بخش اور ہنر کے ساتھ۔ ان کی ایک نظر سے سینکڑوں گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اٹھو اور ان کے تیر کو اپنے دل میں جگہ دو۔

چنانچہ جناب امیرؒ اور اقبال کے درمیان ایک بھرپور مکالمہ ہوتا ہے' جس میں اقبال کشمیر کی

زبوں حالی، پائمالی اور یہاں کے لوگوں پر وقتاً فوقتاً ہوئے مظالم اور زیادتیوں کی روداد سناتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ''میری بانسری میں جو نالہ ہے وہ اسی کے مضمون سے ہے۔ وہ (کشمیری) خودی، خودشناسی سے محروم ہے اور بے چارہ اپنے ہی گھر میں اجنبی ہے۔ اس کے اہلِ حرفت کی اجرت غیروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے دریا کی مچھلی غیروں کے دسترخوان کی زینت ہے۔ کشمیری قوم ایسی ہی نہیں تھی۔ ایک زمانے میں صف شکن، طاقتور، چیرہ دست، جاں باز اور پُر دم تھی۔ اوپر کی سطور میں اس مکالمے کی قدرے ترجمانی ہوئی، یہاں فارسی متن کے الفاظ بھی قارئین کے لیے نقل کیے جاتے ہیں۔

نغمہَ می خواند آں مستِ مدام
در حضورِ سیّدِ والا مقام
سید السادات، سالارِ عجم
دستِ او معمارِ تقدیرِ امم
تا غزالی درسِ اللہ ہُو گرفت
ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت
مرشد آں کشورِ مینو نظیر
میر و درویش و سلاطین را مشیر
خطّہ را آں شاہِ دریا آستین
داد علم و صنعت و تہذیب و دین
آفرید آں مردِ ایرانِ صغیر
باہنر ہائے غریب و دل پذیر

حضرت شاہ ہمدانؒ اقبال کو زندگی کے حقائق سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

بندۂ کز خویشتن دارد خبر
آفریند منفعت را از ضرر
بزم بادیو است آدم را وبال
رزم با دیو است آدم را جمال
خویش را بر اہرمن باید زدن
تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگِ فسن
تیز تر شو تافتد ضربِ تو سخت
ورنہ باشی در دو گیتی تیرہ بخت

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امیرؒ کشمیر کے بڑے محسن گذرے ہیں جنہوں نے اس خطۂ ارضی کو اسلام کی عظیم نعمت سے بہرہ ور کیا اور اقبالؒ وہ فرزند کشمیر ہیں جنہیں اس سرزمین کی فکری، علمی، اقتصادی اور سیاسی فکر دامن گیر تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ خطّہ امن وسکون، خوشحالی اور معاشی استحکام کا گہوارہ بن جائے اور یہاں کے لوگ جہالت، پسماندگی اور جذباتیت سے آزاد ہوکر ایک باعزت زندگی گزار سکیں۔

☆☆☆

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو

(دانائے راز کی یاد میں)

ہندوستان تہذیب وتمدّن کی رنگا رنگی کا ایک ایسا طاقتور مرکز رہ چکا ہے جس پر صدیوں کے وسیع وعریض زمانی فیصلے پر مسلمان حکمرانوں نے اپنے تدبر، ایثار، انصاف اور جذبۂ انسان دوستی کے تحت حکمرانی کی ہے۔ آخری مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کے اقتدار کے زوال کے ساتھ ہی اکثر مسلمان علماً، ادباً، شعرا اور عوام کے ایک بڑے طبقے نے خودسپردگی کے عالم میں مسجدوں، خانقاہوں اور مدرسوں کی راہ لی۔ سال ہا سال تک اپنے آبا واجداد کے کارناموں کا ذکر کرتے رہے، نادر شاہی یلغار اور اکبری تلوار کی طاقت وتوانائی سے اپنے پراگندہ قویٰ کو حوصلہ دیتے رہے۔

چو آں آتش درونِ سینہ افسرد

مسلماناں بدرگاہاں خزیدند

ترجمہ:۔ ایمان ویقین کی وہ آگ جب اس کے سینے میں بجھ گئی مسلمانوں نے درگاہوں کا رخ اختیار کیا۔

مایوسی، خودسپردگی، زوال، افلاس، معاشی تنگدستی اور تعلیمی اعتبار سے پسماندگی کے اندھیروں میں چند نام تاریخ کے اوراق میں بہت ہی نمایاں ہیں جنہوں نے ہندی مسلمانوں کی اجتماعی بیداری اور خاص طور پر تعلیم کے میدان میں انکی ترقی کے حوالے سے آواز اٹھائی،

جو بڑی حد تک موثر ثابت ہوئی۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا محمد علی جوہرؔ اور سر سید احمد خان وہ بااثر شخصیات ہیں جنہوں نے اپنے زورِ قلم اور زورِ بیان سے منجمد رگوں میں تازہ خون دوڑا دیا، اوران کے ساتھ سیکڑوں پُرخلوص انسان شامل ہوگئے، جن کی انتھک کوششوں کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کے تصوّر کو محسوس کرنے لگے اور آئندہ کے لیئے طریق کار وضع کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ شخصیات کی اس خوبصورت کہکشاں میں علامہ اقبال کا نام کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ وہ بیک وقت ایک شاعر، فلسفی، ایک دانشور، ایک مصلح ایک قانون دان، ایک عاشقِ قرآن، ایک شیدائی رسولؐ اور ایک انقلابی تھے۔ وہ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک ایسی محترم شخصیت تھی، جس کے ساتھ ہر مسلک اور ہر خطّے کے لوگ احترام کے جذبات رکھتے تھے۔ اپنے اُردو اور فارسی کلام میں ہندوستان کے کئی مقامات اور شخصیات کا انہوں نے تذکرہ بھی کیا ہے، کبھی انہیں رُومۃ الکبریٰ میں دہلی یاد آتی ہے، کبھی وہ حضرت نظام الدینؒ، حضرت معین الدینؒ، حضرت بوعلی قلندرؒ، نانک، رام، کرشن اور تیرتھ رام کی خدمات کو سراہتے ہیں۔ انہیں شہر دہلی کے ذرّے ذرّے میں اپنے عظیم اسلاف کا لہو خوابیدہ نظر آتا ہے۔ اپنی مشہور نظم ''شعاعِ امید'' کے تیسرے بند کی تمثیل اگر کسی پر صادق آتی ہے، تو وہ ہندوستانی مسلمانوں پر ہی صادق آسکتی ہے۔ نظم کا معنوی ڈھانچہ کچھ یوں ہے کہ سورج اپنی شعاعوں کو واپسی کا پیغام دیتا ہے۔ تمام کرنیں سورج کے آغوش میں سما جانے کے لیے دوڑتی ہیں سوائے ایک کرن کے جو ہندوستان کی فضا کو منوّر کرنے اور مردانِ گراں خواب کو جگانے کے لیے مضطرب ہے۔ انہیں یہ خطّہ مشرق کی امیدوں کا مرکز معلوم ہوتا ہے، اور اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اک شوخ کرن شوخ مثالِ صفتِ حور

آرام سے فارغ صفتِ جوہر سیماب

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو

جب تک نہ ہو مشرق کا ہر ذرّہ جہاں تاب

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو

جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز

اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی

جن کے لیے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن

تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہہ محراب

یہاں ایک بات کو واضح کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کے بعض نقاد اقبال کی حبُ الوطنی کو صرف ان کے ابتدائی کلام کے تناظر میں دیکھتے ہیں' جبکہ شعاع امید ان کے تیسرے اور زندگی میں شایع ہونے والے آخری مجموعۂ کلام میں شامل ہے۔ وطن کے ساتھ محبت اور ہندی مسلمانوں کی فکر کو عمر بھر اقبال کو دامنگیر رہی۔ اپنے ولولۂ تازہ سے جہاں انہوں نے پورے ایشیا کی بیداری کا فریضہ انجام دیا' وہی ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے سوزِ جگر سے مضطرب کرنے میں انہوں نے کوئی کمی روا نہیں رکھی۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں علمی و ادبی مجالس میں شمولیت سے فراغت کے بعد وہ فوراً اس

وقت کے اکابرین سے ملّتِ مسلمہ ہندیہ کے سیاسی معاشی اور تعلیمی صورت حال کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے تھے۔علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے اقبال کی دلچسپی‘ مدراس‘ بھوپال‘ میسوراور دہلی میں ان کے قیام کے دوران انکی مصروفیتوں سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کی سب سے بڑی اقلیت کے مسائل سے کس قدر جڑے ہوئے تھے۔

جاوید نامہ میں اقبال نے ہندوستان کی مجموعی صورت حال کے نہایت ہی عمدہ مناظر پیش کیئے ہیں ۔ایک عنوان ’’روحِ ہندوستان نالہ وفریاد می کند‘‘ قائم کیا ہے جس میں ہندوستان کی موجودہ صورت حال بھی نمایاں ہےاور ہندوستانی مسلمانوں کے دشمنوں جعفراور صادق کے نفاق کی کیفیات بھی واضح کی گئی ہیں۔

جعفر اندر ہر بدن ملت کُش است
ایں مسلمانے کہن ملت کُش است
از نفاقش وحدت قومے دونیم
ملت او از وجودِ او دونیم
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

ہندوستاں میں مسلم مدارس کے بارے میں بھی اقبال فکر مند تھے‘ان کا خیال تھا کہ عصر حاضر کے تقاضوں سے مدارس کو ہم آہنگ کر کے ہی بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد تنگ نظر ادیبوں اور شاعروں نے اقبال دشمنی کا بدترین ثبوت پیش کیا اور اپنے حقیر مادی مفادات کے لیے اردو نصاب سے بڑی حد تک کلام اقبال کو خارج کروادیا لیکن مسلمانوں کی اکثریت اور صحیح فکر رکھنے والے دانشوروں کے نزدیک اقبال اب بھی ایک

محترم نام ہے۔ اقبال ہمارے عہد کی وہ طاقتور انقلابی آواز ہے، جس نے اپنے پُر اثر کلام اور اعلیٰ انسانی محبت کے اصولوں پر مبنی پیغام سے کروڑوں انسانوں کو ایک نیا حوصلہ اور ولولہ عطا کیا۔ ان کے ایمان افروز کلام میں دین و دنیا کا توازن اور حرکت و عمل کا ایک بے مثال جذبہ متحرک نظر آتا ہے۔ یہ کلام جمود، بے عملی، بے یقینی، کی بیماریوں کا قلع قمع کر کے حرکت، عمل، یقین، اور جہدِ مسلسل کا ایک مجموعہ ہے۔

نغمہ کجا و من کجا سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

گذشتہ سال کی بات ہے کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے اہتمام سے کرمنالوجی پر سمینار ہو رہا تھا۔ مدراس سے بھی کچھ لوگ تشریف لائے تھے ۔ وہاں کے ہائی کورٹ کے دو وکلا یونیورسٹی کیمپس کے مختلف بلاک دیکھ رہے تھے، ان کے بیان کے مطابق جوں ہی ان کی نظر اقبال انسٹی ٹیوٹ اور اقبال لائبریری اور سر سید گیٹ پر پڑی وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ ان دو وکلا میں ایک صاحب پروفیسر محمد شریف کا کہنا تھا کہ ہندی مسلمان کبھی بھی اقبال اور سر سید کا احسان بھلا نہیں سکتے ہیں۔

☆☆☆

اقبال......ایک دانشِ نورانی

وہ قوم بڑی خوش بخت ہوتی ہے جس میں دانشور اور تخلیقی صلاحیتوں سے آرستہ افراد جنم لیتے ہیں اور جنکی صلاحیتوں اور ذہنی کاوشوں سے بیداری اور دانشوری کی قندیلیں فروزاں ہو جاتی ہیں۔ یونان کا خطہ ارضی اپنے فلسفیوں، دانشوروں اور تخلیقی فنکاروں کی بدولت اب بھی نازاں ہے۔ ایشیا کی مسلم دانشوری کی تاریخ میں اقبال کے نام کو اس اعتبار سے انفردیت حاصل ہے کہ اقبال مشرق ومغرب کے فلسفیانہ افکار سے بخوبی آگاہ تھے۔ بظاہر وہ ایک شاعر تھے اور انکی شاعری اُردو اور فارسی سخنوری کی روایات کے ساتھ قائم ہے لیکن اقبال کے بال جبریل اور زبورِ عجم کی غزلوں میں روایت شکنی اور رنگ تغزل سے انحراف جابجا نظر آتا ہے۔ یہ غزلیں اور انکی بیشتر نظمیں فلسفیانہ نظریات کی حامل نظر آتی ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کا فکر وفلسفہ عام فلسفے کی کج بحثیوں اور عقلی استدلالی پیچیدگیوں کا سہارا لیتا ہے یا نہیں۔ دراصل اقبال اس بارے میں واضح اور غیر مبہم انداز میں اظہار رائے کر چکے ہیں۔ اقبال دانشوری کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں (الف) دانش نورانی (ب) دانش بُرہانی دانش نورانی سے انکی مراد وہ فراست، فہم وادراک، وجدان اور شعور ہے، جس کے تانے بانے وحی والہام کی سرحدوں کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ حدیث کے مقدس الفاظ میں

اِتّقُو بِفراسته المؤ من فاِنّه یَنظُرُ بِنُورِ الله۔

مومن کی دانشمندی سے ڈرو، بے شک وہ اللہ کے نور سے (اشیاوعناصر) کو دیکھتا ہے۔

دانشِ نورانی انسان کو آفاقی، افلاکی اور کائناتی قوتوں کا حامل بنا دیتا ہے۔ انسان جب اپنے آپ کو ذاتِ حق کے نور سے مزین کرتا ہے، تو اس کا ہاتھ، اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے اور وہ "وَمَارَمَیتَ اِذ رَمَیتَ وَلٰکِنَّ اللہ رَمیٰ" کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں جاوید نامہ میں وہ مکالمہ زیر نظر رہنا چاہئے، جس میں زندہ رود (اقبال) حلاّج سے استفسار کرتا ہے۔

از تو پُرسم، گرچہ پرسیدن خطا است
سرِّ آں جو ہر کہ نامش مُصطفیٰ است
آدمے یا جوہرے اندر وجود
آں کہ آید گاہے گاہے در وجو

حلاج اس اہم سوال کے جواب میں فرماتے ہیں۔

پیشِ او ر گیتی جبیں فرسودہ است
خویش راخود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ ازفہم تو بالا تر است
آدم است وہم ز آدم اقدم است
عبدہ، صورتِ گر تقدیر ہا
اندر و ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدِدیگر، عبدہ، چیزے دگر
ما سراپا انتظار او منتظر

مدّعا پیدا نگردد زیں دو بیت

تا نہ بینی از مقامِ مَا رَ میتَ

اقبال کے پورے کلام میں دانشِ نُورانی کے مظاہر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ نما ہیں۔ کہیں یہ صحابۂ کبار کے جذبۂ قربانی، آلِ نبیؐ کی صداقت وشجاعت، اولیاؔو مشائخ کے قصص وواقعات اور معرفتِ ذات کے نمائندوں کی پاک سیرت سے مزین ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ دانش نورانی اور فکر روحانی جب کسی کے وجود میں سماجاتی ہے تو اس شخص کا ہر عمل رضائے الاہی کے تابع ہوتا ہے۔ چنانچہ خطاب یہ جاوید عنوان کے تحت گجرات کے ایک حکمران سلطان مظفرؒ کا قصہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سلطان مظفر اخلاص عمل میں بے مثال تھا۔ حضرت بایزید بسطامی کے کردار کا حامل تھا۔ اسی بادشاہ کے پاس ایک سبز رنگ خوبصورت خیر الجیاد (اصیل گھوڑا) تھا، میدان جنگ میں تیز رفتار اور بادشاہ کے لیے اپنے بیٹوں کی طرح پیارا تھا۔ یہی گھوڑا ایک بار پیٹ کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ ایک ماہر امراضِ حیوانات نے شراب سے گھوڑے کا علاج کیا اور گھوڑا دردِ شکم سے آزاد ہو گیا۔ پاکیزگی، دانش نورانی اور تقویٰ شعاری کے صفات سے متصف بادشاہ نے اس گھوڑے پر سوار ہونا ترک کر دیا۔ کیونکہ شراب اس کے نزدیک حرام چیز تھی۔ اقبال نے یہاں جونکتہ ابھارا ہے وہ یہ ہے بادشاہ کی داخلی دنیا یقین اور تقویٰ سے اس قدر آراستہ تھی کہ اس نے حرام شے سے شفایاب ہوئی اپنی سواری کو خیر باد کہا اور اطاعت کا ایک نیا نرالا باب واکر دیا۔

؎ شاہ حق بیں دیگر آں یکراں نخواست

شرعِ تقویٰ از طریقِ ماجد است

اے ترا بخشد خدا قلب وجگر
طاعتِ مردِ مسلمانے نگر

دانشوری کا دوسرا خانہ یا حصّہ اقبال کے نزدیک دانش بُرہانی ہے۔اس سے مراد منطق، عقل، اِستدلال، حُجت، دلیل، برہان، علم، اور خبر ہے۔ جبکہ اقبال عشق، یقین، ایمان، ضمیر، روح، قلب، نظر اور عقیدے کی صلابت وصداقت کے قائل ہیں۔اول الذکر اصطلاحات کی اہمیت اور توانائی سے وہ صرفِ نظر نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ علم وعقل، حجت واستدلال اور کتب واخبار کی معنویت کو اجاگر کرتے ہیں۔لیکن یہ امور اور اشیأ جب فکر انسان کو حیرت، تشکیک، ارتداد، الحاد اور اقدار سے بیزاری کی راہ پر ڈال دیتے ہیں تو اقبال کتابوں پر کور ذوقی کا الزام لگادیتے ہیں۔

علم اگر کج فطرت اور بدگوہر ثابت ہوتا ہے۔تو یہ عالم کے لیے حجابِ اکبر(بڑا پردہ) بن کر رہ جاتا ہے۔جاوید نامہ میں اقبال جب حکیم سنائی کی روح سے گفتگو کرتے ہیں تو دانشِ نورانی اور دانش برہانی کا فرق سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ بوعلی سینا دنیائے آب وِ گل کے حالات، کیفیات، نفسیات اور معاملات سے بخوبی آگاہ ہیں۔مگر دل کی دنیا، اور دل سے وابستہ کوائف وحالات سے بوعلی سینا کو کوئی سروکار نہیں۔دل کی باتیں صاحبِ دل سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم وحکمت از کتب، دیں از نظر
بوعلی دانندۂ آب وگلِ است
بے خبر از خستگی ہائے دل است

نیش و نوشِ بوعلی سینا بہل

چارہ سازیہاے دل از اہلِ دل

اقبال حقیقی شاعری کے لیے باطن کی روشنی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک شعر میں یہ روشنی اگر موجود ہے تو شاعری عینِ حیات ہے۔ اور اگر یہ بات نہیں تو سخنوری مرگِ دوام ہے۔

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات

ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

عقل و دانش کی ضرورت سے اقبال منکر نہیں، لیکن جب یہی عقل انسان کو عشق و مستی، جذب و شوق، اور قلب و جگر کی کیفیتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ تو اقبال کو حکیم المانوی نطشے کی فکری بنیادیں کمزور نظر آتی ہیں۔

عاقلاں از عشق و مستی بے نصیب

نبضِ او دادند در دستِ طبیب

با پزشکاں چیست غیر از ریو و رنگ

وائے مجذوبے کہ زاد اندر فرنگ

ابنِ سینا بر بیاضے دل نہد

رگ زند یا حَبِّ خواب آور دہد

اقبال کے یہاں عمل پر زیادہ زور ہے بہ نسبتِ فکر کے۔ ان کے نزدیک ان دونوں میں ایک ایسا تضاد پایا جاتا ہے جس کا ازالہ ناممکن ہے۔ ایک انسان یا تو فکری ہو سکتا ہے یا عملی وہ جناب علیِ مرتضیٰؓ کی عملی زندگی کو دادِ تحسین پیش کرتے ہوئے افلاطون کی

تیزی ادراک کو ثانوی درجہ دیتے ہیں۔

میرے لیے ہے فقط زورِ حیدریؓ کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

اقبال نے ضرب کلیم میں ''ذکر و فکر'' کے عنوان سے جو تین اشعار قلمبند کئے ہیں وہ دانش نورانی اور دانش برہانی کے متبادل الفاظ ہیں۔ ان دو کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے علّم الاسماء
مقامِ ذکر کمالاتِ رُومیؔ وعطاّر
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا
مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان ومکان
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

اقبال جب دانش برہانی کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کے نزدیک دانش فرنگ کا مدار و معیار بھی برہانی ہے۔ وہ دانش فرنگ سے برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ مغرب اپنی بہت ساری مادی، عمرانی، اور سیاسی خوبیوں کے باوصف دانش برہانی سے کام لیکر اپنے خنجر سے خودکشی کے اسباب تلاش کر رہا ہے۔ اقبال کی وہ پیش گوئیاں اور دوراندیشیاں ستّر سال گذرنے کے بعد حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ مغرب اقبال کے خیال میں جس قدر نورانی دانش اور اخلاقی قدروں سے محروم ہوتا جائے گا۔ اسی قدر مغرب کی ہلاکت اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔

اقبال کی دانش برہانی ایک کثیر الجہات موضوع ہے۔ جسکی توضیح وتشریح میں سینکڑوں صفحات سیاہ کئے جاسکتے ہیں۔ اختصاراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذاہب عالم کی پاکیزہ تعلیمات، بالخصوص پیغمبر اسلامؐ کی حیات طیبہ اس دانش نورانی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ جس نے لاکھوں ایسے مقدس نفوس پیدا کئے، جنکی روحانی اورنورانی دانش وبینش آنے والے زمانے کے لیے تشکیک وتحیر حیرت واستعجاب سے بالاتر ایمان ویقین کا نشان راہ ثابت ہوگی۔
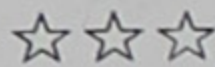
اقبال کا دردمند دل اور کشمیر

کشمیر کی تاریخ کے مختلف ادوار میں دوران مطالعہ ہمیں کئی ایسے نام نظروں کے سامنے آتے ہیں جنہوں نے کشمیری قوم کی فلاح وصلاح، عزت ووقار اور ترقی وآزادی کے لئے ایک بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ تاریخ کی انہی شخصیات میں کشمیر سے دور لاہور میں شعر وادب اور فکر وفلسفہ کی دنیا کا ایک معروف نام شاعر مشرق علامہ اقبال کا ہے، جنہیں اپنے کشمیری الاصل ہونے پر فخر وانبساط حاصل تھا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر انہوں نے اپنے وجود کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ایک خوبصورت تکون ترتیب دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ''میرا جسم خیابانِ کشمیر کا ایک پھول ہے۔ اس جسم میں جہاں تک اس کے اہم ترین عضو دل کا تعلق ہے وہ حجاز یعنی رسول مقبولؐ کی سرزمین کے ساتھ وابستہ ہے اور جہاں تک زبان کا سوال ہے وہ ایران کے علمی شہر شیراز کے ساتھ پیوستہ ہے''۔

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمر

دل از حریم حجاز ونواز شیراز ست

اس شعر میں اقبال نے کشمیر کے حوالے سے گل، خیابانِ اور جنت کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ کلامِ اقبال میں جہاں جہاں کشمیر کا ذکر موجود ہے وہاں اس خطے کے فطری مناظر اور قدرتی مظاہرہ کا نقشہ نہایت ہی حسین لفظوں میں پیش کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کو کشمیر کے پہاڑی علاقوں، درّوں، برف پوش چوٹیوں، وادیوں اور سبزہ زاروں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ فراہم

ہوا ہے۔ان کو اقبال کے وہ فارسی اشعار پڑھ کر ایک کیفیت ،لذت اور طمانیت حاصل ہو گی اور وہ محسوس کریں گے کہ اس سے بہتر کشمیر کے مناظر کی عکاسی فارسی شاعری میں نہیں کی جا سکتی ہے۔

کوہ ہائے خنگ سارِ اونگر
آتشیں دستِ چنارِ اونگر
در بہاراں لعل می ریز دز سنگ
خیز راز حاکش یکے طوفانِ رنگ
لکۂ ہائے ابر در کوہ و دمن
پنبہ پراں از کمانِ پنبہ زن
کوہ و دریا و غروبِ آفتاب
من خدارا دیدم آنجا بے حجاب
با نسیم آوارہ بودم در نشاط
"بشنو از نے" می سرودم در نشاط
مرغکے می گفت اندر شاخسار
با پشیں می نیر زد ایں بہار لالہ
رست و نرگسِ شہلا دمید بادِ
نو روز زی گریبانش درید عمر ہا با
لیدازیں کوہ و کمر نستر از نورِ قمر

پاکیزہ تر عمر ہا گل رخت

بربست وکشاد خاکِ ماد گیر شہاب الدین نزاد

ترجمہ:۔تو اُس وادی کے مائل بہ سیاہ سفید کوہساروں کو دیکھ۔اس کے چناروں کے آتش ناک ہاتھوں پر ایک نظر دوڑا۔ بہاروں میں اس کے پتھروں سے لعل وگہر ٹپکتے ہیں اوراس کی مٹی سے رنگ کا ایک طوفان ظاہر ہوتا ہے۔ بادلوں کے ٹکڑے اس کے کوہ ودمن میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے دُھنئے کی کمان سے روئی کے گالے اُڑرہے ہیں۔ پہاڑ، دریا اور غروبِ آفتاب! میں نے یہاں خدا کو بے پردہ دیکھا ہے۔ایک بار صبح کی ہوا کے ساتھ میں نشاط میں محوِ سیر تھا اور ''بشنو از نے'' گارہا تھا۔(حضرت رومیؒ کی مثنوی کا پہلا مصرعہ بشنو از نے چوں حکایت می کند) ایک پرندہ شاخ پر بیٹھا کہہ رہا تھا کہ یہ بہار دوکوڑی کی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ لالہ بھی اُگا ہے، نرگس شہلا بھی، بادِنوروز نے ان کا گریباں پھاڑ دیا ہے۔ایک طویل زمانے سے اس کوہ وکمر میں چاندنی سے زیادہ پاکیزہ نسترن اُگتی چلی آرہی ہے اور مدت سے یہ پھول مرجھاتے اور کھلتے آرہے ہیں، لیکن ہماری خاک نے دوسرا شہاب الدین پیدا نہیں کیا۔

پیامِ مشرق کی نظم ''ساقی نامہ'' جو اقبال نے نشاط باغ میں لکھی ہے، فنی محاسن کے اعتبار سے ایک شاہکار نظم ہے۔ یہ نظم کشمیر کے مناظر اور شہرۂ آفاق باغات نشاط وشالیمار کے گردوپیش کی نہایت ہی کامیاب عکاسی کرتی ہے۔ نظم جون ۱۹۲۱ء میں لکھی جاچکی ہے، اور اس کے آخری پانچ اشعار میں اقبالؒ نے کشمیریوں کی زبوں حالی، امراء کے ہاتھوں اُن کا استحصال اور پھر ان میں تغیر وانقلاب کی آرزو کا اظہار ملتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ کشمیری تو کٹے پھٹے کپڑوں کو زیب تن کیے ہوئے ہے اور اس کا مالک (خواجہ) ریشم کی قباء پہنے ہوئے ہے

؎ بریشم قبا خواجہ از محنت ِ او
نصیبِ تنش جامۂ تارے

چنانچہ یہ شعر ایک پیش گوئی سے کم ثابت نہیں ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں ریشم کے ایک کارخانے سے ہی ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت کی تحریک شروع ہوئی، اور بالآخر ظلم و بربریت کے بعد ڈوگرہ حکمرانوں کو ریاست کے اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا ؎

ازاں مے فشاں قطرۂ برکشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

کشمیریوں کی پریشانی، غلامی اور اس قوم کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی روپے میں فروخت کرنے پر اظہار رنج و غم کرتے ہوئے اقبالؒ بادِ صبا سے کہتے ہیں کہ اگر تیرا گذر مجلس اقوام جنیوا (لیگ آف دی نیشنز) سے ہو جائے، تو ہم کشمیریوں کی طرف سے وہاں ایک درخواست پہنچانا کہ یہاں کے دیہاتی، اس کے کھیت کھلیاں، ندی اور خیابان بیچ ڈالے گئے۔ ایک قوم بہت ہی سستے داموں فروخت کر دی گئی

؎ بادِ صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دہقان وکشت وجوئے وخیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

بادِ صبا سے کشمیریوں کا مسئلہ لیگ آف نیشنز میں پہنچانے کی بات ۱۸ سال بعد صحیح ثابت ہوگئی، جب مسئلہ کشمیر کو یونائیٹڈ نیشنز میں اُٹھایا گیا اور آج بھی وہ قراردادیں وہاں پر محفوظ ہیں۔ اقبالؒ کا ایک شیدائی اور کشمیریوں کا بہی خواہ آغا شورش کاشمیری بھی کشمیریوں

پر ظلم کرنے والوں سے یوں مخاطب ہے۔

اے ہری سنگھ نواہائے شرر بار سے ڈر
وقت اور وقت کی بدلی ہوئی رفتار سے ڈر
بجلیاں کوند رہی ہیں سرِ میدان وَغا
شیر کشمیر کے آوازۂ پیکار سے ڈر
اپنے محلوں کی دھڑکتی ہوئی بنیاد کو دیکھ
اپنے آغاز کے انجامِ سیہ کار سے ڈر

اپنی معرکتہ الآراء تصنیف ''جاوید نامہ'' میں اقبال کی تخیلاتی ملاقات عالم بالا میں حضرتِ شاہ ہمدانؒ سے ہوتی ہے اور اس بیچ جنابِ ہمدانیؒ انہیں زندگی کے اسرار و معارف سمجھاتے ہیں۔ چنانچہ اچانک غنی کاشمیری نمودار ہوتے ہیں اور اقبال سے کہتے ہیں۔

ہیچ می دانی کہ روزے در وُلر
موجۂ می گفت باموجے دگر

ترجمہ: ''کیا تو نہیں جانتا کہ ایک دن وُلر (ایشیاء میں میٹھے پانی کی بڑی جھیل) میں ایک موج دوسری موج سے کہہ رہی تھی۔ (کالم کی تنگدامنی کے سبب صرف اشعار کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)۔ اس سمندر میں ہم کب تک ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتی رہیں گی۔ اُٹھ تاکہ ہم کنارے کے ساتھ ٹکرائیں۔ ہماری اولاد یعنی وہ دریا جس کا وادی اور کوہ صحرا میں ہنگامہ برپا ہے، ہر وقت اپنے آپ کو راستے کے پتھروں سے ٹکرا رہا ہے، تاکہ پہاڑ کو جڑ سے اُکھاڑ دے۔ وہ جوان جس نے دشت و در پر قبضہ کر لیا ہے، اس نے بہادروں کے دودھ سے پرورش پائی ہے۔ لوگوں کے لئے اس کی شہرت وسطوت محشر کا حکم رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ

ہماری وجہ سے ہے، کسی اور کے سبب نہیں ۔ ساحل تو راستے میں ایک پتھر کی مانند ہے سمندر کے اندر صبح و شام ہی کیوں نہ رہے زندگی تو کوہ و دشت کے درمیان جولانی کا نام ہے۔ اُس موج کا کیا کہنا جو ساحل کو عبور کرے''۔

دراصل جھیل ولر میں لہروں کے درمیان یہ ہم کلامی کشمیر کے سیاسی حالات اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کی شاعرانہ زبان اور اشارہ و کنایہ میں ایک بشارت بھی ہے اور پیش گوئی بھی ۔ چونکہ حقیقی شاعر کا وجدان مستقبل کے حالات سے باخبر ہوتا ہے، اقبال کے عظیم آفاقی کلام میں درجنوں ایسے اشارات ملتے ہیں جو ان کی مومنانہ فراست کی عکاسی کرتے ہیں۔

اقبال کے عہد میں کشمیر کی جو سیاسی ، معاشی اور سماجی صورتحال تھی ، اس پر اقبالؒ اپنی تنہائیوں میں فکر مند اور مضطرب سے رہتے تھے ۔ ان کے نزدیک ترین دوستوں کے بیانات کے بیانات پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ مرحوم کے رگ و ریشے میں کشمیریوں کی محبت موجزن تھی ۔ وہ اس خطے کی جہالت، افلاس اور اس وقت کے شخصی راج کے مظالم کا خاتمہ چاہتے تھے ۔ ایک موقعہ پر ان کے احباب کی محفل میں کسی نے کشمیریوں کے افلاس کا ذکر کیا تو علامہ بولے'' غریبی اور جہالت قوت اِیمان و حریت کی راہ میں نہ کبھی سدراہ ہو سکے ہیں اور نہ ہوں گے ۔ ہم تو اُمی پیغمبرؐ کی امت ہیں ۔ مسلمان کے لئے غریبی اور جہالت کی آڑ لینا اس کی روحانی کمزوری کی پکی دلیل ہے''۔

کشمیریوں کے مفادات کے تحفظ اور یہاں ظلم و تشدد سے لوگوں کو نجات دلانے کی خاطر لاہور میں ''کشمیر کمیٹی'' کا قیام اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس زمانے میں بھی کشمیریوں کے خیر خواہ موجود تھے ۔ اقبال بھی کشمیر کمیٹی کے سرگرم ممبر رہے، تاہم کمیٹی میں

موجود کچھ عناصر کے ساتھ نظریاتی اختلات کے سبب اقبال کمیٹی سے مستعفی ہوگئے۔اس حوالے سے ان کے طویل بیانات کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔کشمیر کے تناظر میں اقبال نے اکابرین کے نام جو خطوط تحریر کئے ہیں، ان سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر کشمیر کے معاملات سے جڑے ہوئے تھے۔منشی محمد دین فوق، منشی سراج الدین پال اور شیخ محمد عبداللہ کے نام مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانانِ کشمیر کا اتحاد و اتفاق ان کی اوّلین ترجیح تھی۔

علامہ اقبال نے شہرۂ آفاق کشمیر مینونظیر کو اپنے لافانی اور آفاقی کلام میں جو مقام دیا ہے، اس سے اِس خطے کی خوبصورتی، تردماغی، فنکاری اور یہاں کے لوگوں کی جرأت و ہمت کو دادو تحسین ملا ہے۔اس مضمون کو اقبال کے ان توصیفی اشعار پر اختتام پذیر کرتا ہوں، جو کشمیر کے اس عظیم محسن نے فارسی میں تحریر کئے ہیں۔

زیرک و درّاک خوش گل ملتے است

در جہاں تردستی او آیتے است

ساغرش غلطندہ اندر خونِ اوست

در نئے من نالہ از مضمونِ اوست

از خودی تا بے نصیب افتادہ است

در دیارِ خود غریب افتادہ است

تانہ پنداری کہ بود است ایں چنیں

جبہ را ہموارہ سود است ایں چنیں

درزمانے صف شکن ہم بودہ است

چیرہ و جانباز و پُر دم بودہ است

ترجمہ: کشمیری ایک ذہین، ہوشمند اور حسین قوم ہے۔ دنیا میں اس کا ہنر معجزہ سے کچھ کم نہیں ہے۔ اس کا پیالہ اس کے اپنے ہی لہو سے بھرا ہوا ہے۔ میری بابسری کی گریہ وزاری کا موضوع یہی قوم ہے۔ کشمیری جب اپنی خودی سے محروم ہوا، تب سے وہ اپنے ہی وطن میں اجنبی بن کر رہ گیا۔

پھر یہ نہ سمجھنا کہ یہ قوم ہمیشہ ایسی ہی تھی۔ غلام بن کر اغیار کے آگے ماتھا رگڑتی تھی۔ کسی زمانے میں یہ قوم صف شکن اور فاتح تھی، غالب اور بڑی دلیر تھی۔
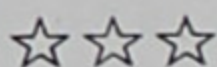
کشمیر میں اقبال شناسی۔ایک مختصر جائزہ
(سنہ ۲۰۰۰ء سے سنہ ۲۰۱۰ء تک)

کشمیر کو قدرت نے یہ امتیاز اور اِعزاز بخشا ہے کہ یہ ہر عہد میں تاریخ ساز اور مَردم خیز ثابت ہوا ہے۔ جو اَفراد اور خانوادے مختلف اَسباب وعلل کی بِنا پر یہاں سے ملک کے اَطراف واکناف میں ہجرت کر گئے تھے ان میں سے کچھ سیاست، شِعر وادب اور علومِ اسلامیہ میں آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے اٹھے۔ چاہے وہ لولاب کشمیر کے علاّمہ انور شاہ لولاؔبی مسعودی ہوں، جن کے بارے میں اِقبال نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ''اسلام کی اِدھر کی پانچ سو سالہ تاریخ انور شاہ کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے''۔ پنڈت نہرو جن کے آباؔ علاقہ زینہ پورہ شوپیان سے اِلہٰ آباد میں ایک نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے نہؔرو کہلائے، ورنہ وہ کشمیر کی مشہور ہندو گوت ''کول'' خاندان سے ہیں۔ اقبال نے تب کہا تھا اور اب بھی یہ صحیح ثابت ہو رہا ہے۔

آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر زروئے شاں خجل
پختہ کار و تیز بین و تیز ہوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش

اصلِ شاں از خاکِ دامنگیرِ ماست
مطلع ِ ایں اَختراں کشمیرِ ماست

اقبال کے آبأ واجداد بھی سپر کولگام اننت ناگ سے تین سو سال پہلے سیالکوٹ ہجرت کر گئے تھے۔لیکن اپنے آبأ کے مرز بوم کے ساتھ شاعرِ مشرق کا جذباتی تعلق تادمِ زیست قائم رہا۔وہ اپنے وجود کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہے کہ جسم کا تعلق کشمیر کی پھلواری ۔سے،دل کا تعلق سرزمینِ عرب سے اور زبان کا تعلق شیراز ایران سے ہے۔

تنم گلے زخیابانِ جنّتِ کشمیر
دل از حریمِ حجاز ونواز شیرازست

اقبال کی شہرۂ آفاق شخصیت اور فکر ونظر کے ساتھ تقریباً ایک صدی پر محیط اہالیانِ کشمیر کی محبت وعقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ عوامی سطح پر درجنوں کالونیوں،محلّوں،مسجدوں،بازاروں،گلیاروں،پن بجلی پروجکٹوں،اور صنعتی وتجارتی اداروں کے نام اقبال سے منسوب ہیں ۔اور اسی طرح متعدّد اسکولوں،علمی اِداروں، لائبریریوں اور لیبارٹریوں کے نام بھی علامہ سے موسوم ہیں ۔سرکاری سطح پر کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ اور سنٹرل لائبریری بھی علامہ اقبال کی ذات سے معنون ہیں۔چنانچہ راقم السطور کی ذاتی تگ ودو سے کشمیر یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے لیے اس وقت ایک سہ منزلہ عمارت زیرِ تعمیر ہے۔

ہندوپاک کے اہم علمی مراکز اور شخصیات کی طرف سے ہر سال کوئی نہ کوئی کتاب اقبال کے فکروفن سے متعلق منظرعام پر آتی رہتی ہے۔کشمیر میں نامساعد سیاسی حالات کے

باوجود گذشتہ دس برسوں میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے کئی اہم کتابیں، مجموعہ مقالات اور ''اقبالیات'' (سالانہ مجلّہ) کے نو شمارے چھپ کر آچکے ہیں۔ حامدی کاشمیری کی کتاب ''اقبال کا تخلیقی شعور'' ۲۰۰۱ء میں عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ چھپ کر ادبی حلقوں میں داد و تحسین پا چکی ہے۔ یہ کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔ تنقیدی زاویہ نگاہ سے تحریر کئے گئے ان مقالات کے عنوانات یوں ہیں۔

۱۔ اقبالیاتی تنقید......ایک جائزہ

۲۔ کلام اقبال تنقیدی طریقِ کار

۳۔ اقبال کی شعری حسیت کی شناخت

۴۔ اقبال: فکر و نظر کے آفاق

۵۔ فکر اقبال کی تخلیقی بازیافت

۶۔ اقبال کی شاعری کا استعاراتی نظام

۷۔ اقبال کا شعری عمل

۸۔ اقبال شناسی روح اقبال کے حوالے سے

۹۔ اقبال اور تعمیر آدمیت

۱۰۔ اقبال: اکیسویں صدی میں

اسی نوعیت کی دوسری اہم کتاب ''اقبال کی تخلیقیت'' انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شائع کی گئی۔ اس کے مصنف ڈاکٹر قدوس جاوید ہیں۔ یہ کتاب سات مقالات پر مشتمل ہے اور اس میں حسبِ ذیل موضوعات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

۱۔ اقبال شناسی...... مفہوم و معیار

۲۔ تخلیقیت ...... اسرار و رموز

۳۔ اقبال کی تخلیقیت

۴۔ اقبال کی تخلیقیت ...... قاری اور قرأت

۵۔ اقبال کی تخلیقیت ...... متن اور بین اُلمتونیت

۶۔ اقبال کی تخلیقیت اور غزل

۷۔ اقبال کی تخلیقیت اور استعاراتی نظام

مذکورہ دو کتابوں کے مصنفین اُردو زبان و ادب کے ناقدین میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں نے فکری صلابت اور تنقیدی بصیرت سے کام لیتے ہوئے اقبالیاتی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے حامدی صاحب کی اقبالیات پر دو اہم کتابیں ''حرفِ راز'' اور ''آئینہ اِدراک'' چھپ چکی تھیں۔

اقبال شناسی کی روایت کو زندہ رکھنے میں جن غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں نے تقسیم ہند کے بعد ایک کلیدی رول ادا کیا ہے۔ ان میں آنجہانی پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انکی وصیت کے مطابق ان کا کتب خانہ علامہ اقبال لائبریری کا گوشہ آزاد کی صورت میں موجود ہے۔ یونیورسٹی نے اس حُسنِ ادا کے لیے ''جگن ناتھ آزاد گولڈ میڈل'' دینے کا فیصلہ کیا ہے جو ہر سال اقبالیات میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو دیا جائے گا۔

آزاد صاحب کی وفات کے بعد اکتوبر ۲۰۰۴ء میں ''جگن ناتھ آزاد شخصیت اور

خدمات'' کے عنوان پر دوروزہ قومی سمینار کا انعقاد اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ہوا۔ ریاست اور ملک کے بیس سر کردہ ادیبوں نے آزاد کی اقبال دوستی، ادب نوازی اور شعرو شاعری پر مفصّل مقالات پیش کیے جن کو بعد میں ''فکر آزاد'' کے نام سے کتابی شکل میں شایع کیا گیا۔ دوسو صفحات پر مشتمل یہ کتاب علمی حلقوں میں بہت پسند کی گئی۔

۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۳ء میں راقم کی تین کتابیں منظرعام پر آگئیں۔

ا۔ ''مسائل تصوف اور اقبال'' ''اقبال......عرفان کی آواز'' اور ''اقبال ایک تجزیہ۔'' تینوں کتابیں اقبال کے نظریۂ تصوف، وحدت الوجود، وحدت الشہود، نظریۂ عرفان وسلوک اور اقبال کے فکری سرچشموں سے متعلق ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ۲۰۰۰ء ۲۰۰۲ء میں اہم مقالات پر مشتمل دو کتابیں ''نفحاتِ اقبال'' اور ''اقبال کی تجلیات'' چھپ کر علمی حلقوں میں کافی پسند کی گئیں۔ اسی مدت کے دوران وادی کے ایک ماہر تعلیم پروفیسر سید حبیب کو انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دو مانوگراف تحریر کرنے کی استدعا کی گئی، چنانچہ انہوں نے "Iqbal's Raptures Melodize Education" اور ''رازِ الوند'' تعلیمی نقطۂ نگاہ سے لکھ کر اقبال شناسی میں ایک قابل تحسین اضافہ کیا۔ معروف اُردو شاعر مرحوم حکیم منظور نے بھی اسی دوران انسٹی ٹیوٹ کی گذارش پر کالجوں کے طلبہ کے لیے ''اقبال......ایک تذکرہ'' کے نام سے ایک کتابچہ تحریر کیا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سے فارغ التحصیل کئی محققین جو اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں نے اپنے تحقیقی مقالات کو چھاپ کر کشمیر میں فکرِ اقبال کی ترسیل میں قابل قدر حصّہ ادا کیا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی کا مقالہ ''نظریۂ اجتہاد اور

اقبال'' سید شبیر احمد بخاری کا مقالہ ''کلام اقبال کے اَعلام ومشاہیر'' ڈاکٹر فریدہ کاک کا مقالہ ''اقبال اور کشمیر'' اور ڈاکٹر ریاض توحیدی کے اقبال پر مضامین کا انتخاب ''جہانِ اقبال'' چھپ کر کشمیر میں اقبال شناسی کی روایت اور اشاعت میں اہم کارنامے تصور کئے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق احمد مسعودی اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد یونیورسٹی کا مقالہ "Alghazali and Iqbal:-Their Perspective on Education" اور ڈاکٹر نذیر احمد شیخ کا مقالہ ''اقبال اور سوشلزم'' بھی کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ مواد، زبان اور تقابلی مطالعات کے اعتبار سے موخر الذکر دو کتابیں گذشتہ دس برسوں میں کشمیر میں اقبالیات کے حوالے سے اہم کتابیں تصور کی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر مرغوب بانہالی کی اقبالیات پر دو کتابیں ''آدم گریٔ اقبال'' اور ''اقبال کے فکری وروحانی سرچشمے'' میزان پبلشیرز سرینگر کے اہتمام سے بڑے دیدہ زیب انداز میں چھپی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعے سے پروفیسر مرغوب صاحب کی اقبال شناسی اور اقبال سے عقیدت مندی کی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ۲۰۰۸ء اور ۲۰۰۹ء میں کشمیر میں تحریک حریت کے صفِ اول کے رہنما سید علی گیلانی صاحب کی کتاب اقبال۔ ''روح دین کا شناسا دو جلدوں پر مشتمل تعمیر ملت مائسمہ سرینگر کے اہتمام سے چھپی ہے۔ سات سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب اقبال کے اسلامی، انقلابی، ملّی اور درد و عشق سے لبریز اُردو اور فارسی اشعار کی عالمانہ تشریح وتوضیح کا ایک مرقع ہے۔ اس کتاب کی پیشانی پر اقبال کا یہ شعر درج ہے۔

ازتب وتابم نصیبِ خود بگیر
بعداز یں ناید چو من مردِ فقیر

۲۰۰۲ء میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے پروفیسر حمید نسیم رفیع آبادی ڈائریکٹر اسلامک اسٹڈیز کشمیر یونیورسٹی کی تحریر کردہ کتاب ''خطباتِ اقبال کا تنقیدی جائزہ'' (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں) شایع کی گئی۔ فاضل مصنف نے اس کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ خطبات اقبال پر اُردو میں لکھی گئی بعض تصانیف کا تنقیدی جائزہ۔

۲۔ اقبال کا تصورِ نبوت اور مسلم فلاسفہ و متکلمین۔

۳۔ اقبال کے تصورِ زمان ومکان کا ایک تحقیقی جائزہ۔

ریاست جموں وکشمیر کے معروف صحافی اور شاعر جناب غلام نبی خیاؔل کی کتاب ''اقبال اور تحریکِ حریت کشمیر'' ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی عرقریزی سے اقبال اور کشمیر کے حوالے سے جملہ مواد کو اکٹھا کیا ہے۔ اور کچھ متنازع امور کو بھی زیر بحث لایا ہے۔ خیال صاحب نے اقبال کی کچھ فارسی نظموں کا بہت ہی عمدہ منظوم کشمیری ترجمہ کیا ہے۔ خاص طور پر حُدی (نغمۂ سار بانِ حجاز) کا۔

ریاست کے کئی نامور ادیبوں ناقدوں اور شاعروں کے نثری وشعری مجموعے گذشتہ برسوں میں بڑے تزک واحتشام کے ساتھ شائع ہوئے ہیں جن میں اقبال کے حوالے سے کوئی نہ کوئی مضمون شامل ہے۔ سید رسول پانپر کی تین کتابیں ''رشحاتِ آیام'' ''آبگینے'' اور پیش آہنگ'' انتہائی محنت، خلوص اور اعلیٰ ادبی معیار سے آراستہ و پیراستہ

ہیں۔ یہ تینوں کتابیں ریاستی اور قومی سطح کے انعام واکرام کی مستحق ہیں۔

گذشتہ دس برسوں میں کشمیر کے کثیرالاشاعت اُردو اور انگریزی اخبارات میں فرزندِ کشمیر اقبال کی شخصیت ، عہد ، حالات ، حیات ، کارناموں ، اور کشمیر کے ساتھ انکی نسبتوں پر ہزاروں چھوٹے بڑے مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔ کشمیر کی معروف روحانی شخصیت حضرت شیخ نورالدین نورانی ؒ اور اقبال کے اشعار کا ایک تقابلی مطالعہ جناب اسداللہ آفاقی نے کیا ہے۔

ریاست میں انتہائی ناموافق سیاسی حالات کے باوجود اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی گذشتہ برسوں میں کافی متحرک رہا اور چھوٹے بڑے سمینار اور ادبی محافل کا انعقاد کرتا رہا۔ ایک لاکھ سے زائد اشعار کے رنگین Stickers لداخ سے لیکر کشتواڑ کے آخری دیہاتوں تک پہنچائے گئے ۔اور اس طرح وادی کے کالجوں ، اسکولوں اور لایبریریوں میں فکر انگیز اور نور بصیرت کی آرزو سے معمور اشعار درودیوار پر نصب کئے گئے ۔ انسٹی ٹیوٹ کی تیس سال کی علمی کاوشوں کا احاطہ جناب ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے ''جامعہ کشمیر اور اقبالیات'' لکھ کر کیا ہے۔ یہ تحقیقی پروجیکٹ ڈاکٹر بٹ نے دو سال کے عرصے میں مکمل کیا اور ۵۲۹ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ کتاب انسٹی ٹیوٹ کے یوم آغاز سے لیکر آج تک کی تمام سرگرمیوں کا دائرۃ المعارف ہے ۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر کبیر احمد جائسی نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ماہانہ ترجمان'' کانفرس گزٹ'' کے مارچ ۲۰۱۰ء کے شمارے میں لکھا ہے۔

''ڈاکٹر بدرالدین بھٹ کی اس کاوش کو بجاطور پر اقبال انسٹی ٹیوٹ انسائیکلوپیڈیا

قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اپنی اس تالیف کی ابتدا کشمیر کے تاریخی پس منظر کے مطالعے سے کی ہے......اس مطالعے میں ڈاکٹر بدرالدین بٹ نے ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ انہوں نے انسٹی ٹیوٹ کے تدریسی عملے کی حیات اور کارناموں کی تفصیل رقم کردی ہے۔ سرور صاحب ہوں یا دوسرے اساتذہ، ان کے بارے میں کہیں نہ کہیں کچھ مواد مل جاتا ہے۔ لیکن شاہ ولی اللہ دہلوی پر کام کرنے کے باوجود صبیح احمد کمالی مرحوم کے کوائف حیات سے بیشتر لوگ ناواقف ہیں۔ ڈاکٹر بھٹ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کمالی صاحب کے بارے میں آئندہ نسلوں کے لئے ایک ایسا مواد جمع کر دیا ہے۔ جسکی مدد سے لوگ ان کے بارے میں کچھ جان سکیں گے۔''

اس مختصر مضمون میں راقم السطور نے حالیہ برسوں میں اقبال پر ہوئے کام کا صرف ایک خاکہ پیش کیا اور اس کام کے حسن و قبح سے کوئی بحث نہیں کی کیونکہ یہ مضمون اس بحث کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔
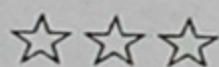
تین اہم شہر اور اقبالؒ

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است

اقبال کی پیدائش برِ صغیر کے اس پُر آشوب عہد میں ہوئی جب ہندوستان ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا اور گشت وخون کا وہ بازار گرم نہ تھا، جو تقسیم کے بعد پورے ملک میں دیکھنے کو ملا۔ اس ملک کے عظیم تہذیبی، روحانی، اخلاقی، اور تمدّنی وِرثے کے تمام تر مراکز سے اقبال بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ دنیا کے جس خطّے کا انہوں نے سفر کیا اس کے مقابلے میں ہندوستان کی تاریخی اہمیت، اسکی وسعت، کثرت میں وحدت اور رنگارنگی کا انہوں نے بھرپور اظہار کیا ہے۔

سَوادِ رُمتہ الکُبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے
وہی عظمت، وہی رفعت وہی شان، دلآویزی

اپنے شاندار شعری وتخلیقی سفر میں اقبال نے ہندوستان کی آب وہوا، فضا جغرافیہ اور مذاہب، غرض اس دیس کے ہر پہلو کو ابھارا ہے اور وطنی شاعری کے ایسے خوبصورت راگ الاپے ہیں، جن کا اعلیٰ شاعری میں جواب نہیں۔

لیلئ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خُوش نما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

ہندوستان کے ہر ذرّے سے محبت اور، اس کے شاندار ماضی اور اسکی اعلیٰ روحانی روایات و اقدار کوسراہتے ہوئے ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں اقبال یوں گویا ہیں۔

ٹوٹے تھے جو ستارے فارس کے آسماں سے
پھر تاب دے کے جس نے چمکائے کہکشاں سے
وحدت کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکاں سے
میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

عنوان بالا اگر چہ زادۂ ہندم فروغ چشمِ من است'' کی وضاحت اقبال نے دوسرے مصرعے میں کی ہے اور اپنی آنکھوں کی روشنی و بینائی کو تین شہروں کی پاک مٹی کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور وہ تین شہر ہیں

''زخاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز''

ترجمہ:۔ (بخارا، کابل اور تبریز کی پاک مٹی سے) شعر کی مجموعی فضا آدمی کو ان تین شہروں کی تاریخی روایات، اور ان سے وابستہ شخصیات کے کارناموں اور روحانی کمالات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ مشرق کی اِسلامی تاریخ میں بخارا کے علماء اور اولیاء اللہ، تبریز کے حضرت شمس تبریزیؒ اور کابل کے متعدد بزرگوں اور حکمرانوں نے کتنا بڑا حصّہ ادا کیا ہے۔

ان شہروں سے وابستہ خدا رسیدہ شخصیتوں نے دینی، اخلاقی اور روحانی سطح پر ایسے کار ہائے نماں انجام دیئے ہیں جن کو سن کر اور پڑھ کر انسان ورطۂ حیرت میں پڑتا ہے۔ مرزا صائب تبریزی نے شہرِ کابلؔ کی تعریف میں ایک بار کہا تھا ''خوشا وقتے کی چشمم از سوادش سُرمہ چیں گردد''۔ اقبال جب حکومتِ افغانستان کی دعوت پر کابل تشریف لے گئے تھے تو وہاں کے مختلف شہروں، اداروں اور مقدس مقامات کا انہوں نے اپنی مثنوی ''مسافر یعنی سیاحت چند روزۂ افغانستان'' میں تفصیلاً تذکرہ کیا ہے۔ کابلؔ شہر کی منظر کشی کرتے وقت اقبال بہترین لفظیات کا سہارا لیکر ایشیا کے اس اہم مراکز کے کوہ و بیابان، آب و ہوا، اور اس شہر کے باشندوں کی خوش مزاجی کو شعر کی زبان میں یوں پیش کرتے ہیں۔

شہر کابل! خطّۂ جنت نظیر
آب حیوان از رگِ تاکش بگیر
چشمِ صائبؔ از سوادش سرمہ چیں
روشن و پائندہ باد آں سرزمیں
در ظلامِ شب سمن زارش نگر
بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر
آں دیار، خوش سواد آں پاک بوم
بادِ او خوشتر زبادِ شامؔ و رومؔ

ترجمہ:۔ کابل کا شہر، جنت کے مانند ایک خطہ ہے' اس کے انگور کی ٹہنیوں سے آبِ حیات حاصل کر صائبؔ کی آنکھ اسکی مٹی کی سیاہی سے سرگیں ہے، وہ سرزمین روشن اور ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سمن زاروں کو دیکھ۔ سبزہ کے فرش پر صبح

رقصاں ہے وہ خوبصورت اور پاکیزہ مٹی جسکی شام اور اروم کی ہوا سے خوشگوار ہے۔

ویسے بھی اقبال افغانستان کی عظیم الشان مملکت کے ساتھ جذباتی تعلق رکھتے تھے۔اس کا اظہار انہوں نے ''جاوید نامہ'' میں نہایت صاف الفاظ میں کیا ہے اور عالمی سیاسی منظر نامے اور جنوبی ایشیا کی صورت حال کو زیر نظر رکھتے ہوئے اسّی سال پہلے کہے گئے اشعار ایک عارف باللہ کی پیش گوئی سے کچھ کم نہیں ہیں۔

آسیا یک پیکر آب و گلِ است
ملّت افغاں دریں پیکر دل است
از فساد، او فسادِ آسیا
از کشادِ او کشاد آسیا

ترجمہ:۔(ایشیا پانی اور مٹی سے بنے ایک جسم کے مانند ہے ملتِ افغانستان اس جسم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے اس کا انتشار پورے ایشیا کا انتشار ہے اور اس کے سکون واطمینان سے ایشیا میں امن وسکون ہے) حقیقت میں آج افغانستان کی خراب صورت حال اس پورے خطّے کے لیے پریشانی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ چنانچہ سامراجی سلطنتوں کے مفادات خطّے میں عدم استحکام سے محفوظ ہیں، لہٰذا وہ ان تمام سازشی منصوبوں اور چالاکیوں کا سہارا لے رہے ہیں، جن سے اس ملک کو اپنے تسلّط میں رکھنے کی راہ ہموار ہو۔اقبال کابل کی مٹی سے آنکھوں کی روشنی کو جوڑتے ہوئے دراصل پورے علاقے کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں۔

جناب رسولِ رحمتؐ کی ذات اقدس کے ساتھ اقبال کی والہانہ عقیدت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ قندھار، کابل کے متصل ایک دوسرے اہم شہر کا نام ہے یہاں کا انار عالمی شہرت کا حامل ہے اور اسی شہر میں حضور نبی اکرمؐ کا خرقۂ مبارک تشریف فرما ہے۔ چونکہ شہر کو محبوبؐ کے ساتھ ایک

مناسبت ہے تو اقبال اس نسبت کے تناظر میں پانچ اشعار پر مشتمل ایک چھوٹی سی منظری نظم تحریر کرتے ہیں۔نظم کا عنوان ہے۔' [قندھار وزیارتِ خرقۂ مبارک''

قندھار آں کشورِ مینو سواد
اہلِ دل را خاکِ او خاکِ مراد
رنگ ہا بو ہا ہوا ہا آب ہا
آب ہا تابندہ چوں سیماب ہا
لالہ ہا در خلوتِ کہسار ہا
نار ہا یخ بستہ اندر نار ہا
کوے آں شہر است مارا کوے دوست
سارباں بر بندو محمل سوے دوست

ترجمہ:۔قندھار جو جنت کے مانند ایک ملک ہے۔اہل دل کے لیے اسکی مٹی خاکِ مراد کے برابر ہے۔ یہاں کی رنگارنگی ،خوشبوئیں ، پانی اور پانی بھی ایسا جیسے پارہ ہوتا ہے۔ اسکے پہاڑوں کی تنہائی میں گلِ لالہ ہیں ۔ یہاں انار کا میوہ اپنے اندر منجمد ہے۔ اس کے شہر کا کوچہ ہمارے لیے محبوب کا کوچہ ہے

حضرت جلال الدین رومیؒ کے اعلیٰ شاعرانہ اور متصوفانہ مقام ومرتبہ سے ہر صاحبِ دل باخبر ہے۔ان کے گہرے مشاہدات اور روحانی تجربات نے مشرق ومغرب کو یکساں متاثر کیے بغیر نہیں چھوڑا۔رومؔی کے روحانی مرشد حضرت شمس تبریزیؒ فنا اور بقا کے اسرار ومعارف سے کُلّی طور باخبر تھے۔ رومی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انکی تعمیر وتربیت میں تبریزی کا ہاتھ ہے اورانفس وآفاق کے راز ہاے سربستہ کو کھولنے میں تبریزی نے میری معاونت کی ہے۔

ظاہر ہے کہ جب اقبال بار بار جلال الدین رومیؔ کو بحرِ پُر اسرار، قافلۂ شوق کا سالار، اپنے آپ کو 'مرید ہندی' اور ان کو پیر رومیؔ، کے القاب سے یاد کرتے ہیں، تو رومی کے مرشد کا تذکرہ کیے بغیر بات ادھوری رہ جاتی۔ شمس تبریزیؒ کے دیوان کے مطالعہ سے ان کے شعورِ نفس، ادراکِ ذات، احساسِ کائنات اور جذب وشوق کے اعلیٰ مقامات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اقبال اپنے قارئین وسامعین سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ مجھے دیکھ (یعنی میرے افکار سے آگاہ ہو) کہ ہندوستان میں میرے بعد کوئی دوسرا نظر نہیں آئے گا جو برہمن زادہ ہوتے ہوئے رومی وتبریزی کے رموز واسرار سے آشنا ہو۔

؎ مرا بنگر کہ در ہندوستاں آخر نمی بینی

برہمن زادۂ رمز آشنائے رومؔ وتبریزؔ است

ترجمہ:۔ مجھے دیکھ کہ ہندوستان میں کوئی دوسرا نظر نہیں آئے گا۔ ایک برہمن زادہ جو رومی اور تبریزی کے رازوں سے آشنا ہے۔

تاریخ ادبِ فارسی کے مطالعہ سے ان دوسر برآوردہ شخصیتوں سے لاتعداد تشنگانِ ایمان و عرفان ہر دور میں سیراب وشاداب ہوتے نظر آتے ہیں اور صدیاں گذرنے کے بعد مشرق و مغرب کے روشن ضمیر ان کے نام پر سمیناروں اور کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دیتے ہیں۔

اقبال اکادمی پاکستان سے ۲۹۵ صفحات پر مشتمل انگیزی میں تحریر کی گئی کتاب

" The Republic of Rumi"

کے نام سے چھپی ہے جس میں عرفانِ رومی کے مقالات سامنے لائے گئے ہیں۔

اقبال نے اپنی آفاقی شاعری میں کئی موقعوں پر اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کے جسم کا تعلّق خیابانِ کشمیر سے، زبان کا تعلق شیراز سے اور دل کا تعلق حجاز یا جزیرہ نمائے عرب کے ساتھ

ہے۔ دوسرے موقعہ پر مدینۂ منورہ اور نجفِ اشرف کی خاک کو آنکھوں کا سُرمہ بتاتے ہوئے اپنے عظیم محبوبؐ کے ساتھ اور بابُ العلم جناب علی مرتضیٰؓ کے تئیں اپنی نسبتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

تنم گلے ز خیابان، جنتِ کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

ترجمہ:۔ میرا جسم خیابانِ کشمیر کا ایک پھول ہے دل عرب سے اور زبان شیراز سے منسلک ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

فکر اقبال کے گہرے مطالعہ سے اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ وہ بلادِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ سے کسقدر روحانی اور وجدانی کیف وانبساط حاصل کرتے ہیں ۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

بخارا کے ساتھ اقبال کی وابستگی اس شہر کے ہزاروں علماء کی وجہ سے تھی، اور تاریخی طور پہ علماء دین کا بڑا اہم مرکز رہ چکا ہے۔ علومِ اسلامیہ کے پھیلاو میں جن مراکز اور مقامات کا حصہ رہا ہے، اقبال نے علحدہ ان کا ذکر کیا ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

بغداد، دہلی، لاہور اصفہان، تہران، غرناطہ، قسطنطنیہ، اشبیلہ، صِقلیہ، فلسطین، مصر و شام اور عراق و پارس جیسے بلاد و اَمصاد کی طرف اشارات کرتے ہوئے اقبال اپنے ضمیر میں چھپے

جذبات کی دیانت دارانہ نشاندہی کرتے ہیں، کہ ان کے فکر ونظر کو تقدس اور توقیر بخشنے میں ان مقامات واماکن کی ایک منفرد معنویت اور اہمیت ہے۔

نئی صدی میں
شاعرِ مشرق کی معنویت

عہدِ جدید اپنی تمام تر مادی اور سائنسی ترقی کے ساتھ آگے کی جانب گامزن ہے۔ انسانی فکر اور سائینسی علوم میں وسعت، پھیلاؤ، کشش اور قوت میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور انسان سورج کی شعاعوں اور فضائے بسیط کی گزرگاہوں سے آگے نئی منزلوں اور نئے راستوں کی تلاش میں سرگرم عمل ہے۔ مریخ و مشتری پر بستیاں آباد کرنے اور خلا کی پہنائیوں میں خیابان و گلستان سجانے کے منصوبے انسان کے ذہن میں متشکل ہو رہے ہیں، اور ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آنے والے سال انسانی تخلیقات کے اعتبار سے حیران کُن بھی ہونگے اور اطمینان بخش بھی۔ لیکن اس ہمہ گیر ترقی اور زبردست پیش رفت کے باوجود انسان کو ہر زمانے میں روحانی اقدار اور اخلاقی تربیت کی ضرورت پری ہے۔ یہ تربیت سائینس کی تجربہ گاہوں، اور علوم جدیدہ کی دانشگاہوں میں آج مفقود بھی ہے اور آئندہ بھی اس کے موجود ہونے کے بہت کم امکانات نظر آتے ہیں۔ جدید تعلیمی مراکز انسان کو عصری علوم کی باریکیوں اور دانشوری کی نزاکتوں سے بہرہ ور تو کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے انسانیت کے ارفع مقام سے گرا کر حیوانوں کی صف میں اور سفلی جذبات کی رو میں بہا کر لے جاتے ہیں

؎ علم اگر کج فطرت و بد گوہر است
پیشِ چشم، ما حجابِ اکبر است

(اقبال)

گذشتہ صدی نے اردو اور فارسی شاعری میں چند بہت ہی بلند مرتبہ شعرا کو جنم دیا، جنکی طاقتور فکر نے شاعری کا رخ پلٹ دیا اور شعر کے بارے میں روایتی نقطۂ نظر کلی طور بدل کر رہ گیا۔ گذشتہ صدی کی انہی توانا شعری آوازوں میں اقبال کی آواز سب سے موثر۔ ر اور طاقتور ثابت ہوئی۔ ان کے کلام میں متنوع دھارے ملتے ہیں، جن میں قومی نظموں کا ابتدائی دور بھی ہے اور فطرت کے مظاہر سے بے پناہ خواہش کا اظہار بھی۔ انگریزی ادب کے اثرات اور المانوی تہذیب کے مثبت پہلو بھی۔ تاہم شعری سفر کی ابتدا میں ہی مذہبی حسیت کی لہریں شعری آگہی کی سطح پر آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ شعروادب میں یہ مسئلہ کافی اہمیت رکھتا ہے کہ فن کی سطح پر کس طرح عرفانِ ذات، انسان اور کائنات کے مسائل کو پیش کیا جائے۔ جدید شاعری میں تخلیق کار کی وابستگی، ترسیل کی ناکامی اور بیانات کے تفاوت وتضاد اور دوسرے گوشوں پر گفتگو ہوتی رہتی ہے لیکن موجودہ عہد کے ناقدوں کے ایک بڑے گروہ کا یہ اصرار کہ شاعری کو صرف علامتوں ہی کے ذریعے برتا جائے شعر کے مختلف رنگ وروپ سے چشم پوشی کرنے کے برابر ہے۔

اقبالؒ کے فکری سفر کا محور جہانِ نو کی تلاش تھی۔ ان کے خیال میں زمانے کے دامن میں تغیر وتبدل کو ثبات حاصل ہے۔ ان کا نقطۂ نظر احیا پرستی کا ترجمان نہیں بلکہ تازہ بستیوں کے احساس کا داعی ونقیب ہے۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

اقبال نے قصۂ قدیم وجدید کے فرق کو احسن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس پر ایک مخصوص انداز سے نقطہ چینی کی ہے۔ انہوں نے تصور خودی کے ذریعے ایک

فعال شخصیت کا خواب دیکھا۔ اقبالؒ کی تخلیقی فکر محدود نہیں ہو جاتی ہے، بلکہ وہ وسیع تر سطح پر ہر مکتبۂ فکر کے لئے سرچشمۂ تحریک رہتی ہے۔ اقبالؒ کی فکر کے مقابلے میں سرسید کی تحریک کا دائرہ کار محدود رہا ہے۔ سرسید کی فکر ہندوستان تک محدود ہو کر رہ گئی جبکہ اقبالؒ کے افکار میں عالمگیریت، آفاقیت کی وسعت دکھائی دیتی ہے۔ فیض احمد فیض اس دور کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ وہ منظوم خراج عقیدت جب اقبالؒ کے حضور میں پیش کرتے ہیں، تو وہ اقبال کو ایک ''خوش نوا فقیر'' اور اس کے گیت کو دلوں میں اترنے والا اور اثر انداز ہونے والا قرار دیتے ہیں۔

''بہت سی باتیں جن میں محض وہم وگمان کے بل پر لوگ سلوگنز (Slogans) کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ اقبالؒ نے ان کے سوچنے کا غور کرنے کا، مشاہدہ کرنے کا، مطالعہ کرنے کا، تجزیہ کرنے کا، استنباط کرنے کا، اور سارے ذہنی پروسس (Process) سے گزر جانے کا ڈھنگ سکھایا۔ صرف خواص کو ہی نہیں بلکہ عوام کو بھی۔ اقبالؒ نے لوگوں کے ذہن کو ان اثرات سے ایک حد تک آزاد کرنے میں امداد دی جو غلامی کے سبب پیدا ہو گئے تھی۔ ان کا آخری دور جو انکی پختگی کا دور ہے، جبکہ وہ انسانیت اور جملہ کائنات کے بارے میں اپنے افکار کا اظہار کرتے ہیں۔ آفاقی طریقہ سے سوچنے کا سلیقہ ہمارے ہاں اقبالؒ نے پیدا کیا۔ ہمارے ہاں اس سے پہلے شعر یا تو تفریحی چیز سمجھی جاتی تھی یا غنائیہ سی چیز تصور کی جاتی تھی۔ شعر میں فکر اور شعر میں حکمت اور شعر میں وہ عظمتیں جن کو ہم شاعروں سے نہیں، فلاسفروں سے متعلق کرتے ہیں وہ محض اقبالؒ کی وجہ سے ہمارے یہاں پیدا ہوئی ہیں۔ اقبالؒ کی مثال ہمارے ہاں ایک ندی یا ایک نہر کی سی ہے جو کہ ایک ہی سمت میں جا رہی ہو، بلکہ ان کی مثال تو ایک سمندر کی سی ہے جو چاروں طرف محیط ہے''۔

موجودہ عہد جس کی تیز تر مادّی اور مشینی ترقی کا ابتدائی سطور میں ذکر ہوا، اس عہد یا اس صدی

میں اقبالؒ کے انسانی اور آفاقی فکر کی افادیت اور معنویت کیا ہے۔ تو اس سلسلے میں پہلی بات واضح رہے کہ اقبالؒ کے افکار کلی طور ان کے اپنے نہیں ہیں، بلکہ ان کا حقیقی منبع وہ عظیم آسمانی، روحانی اور قرآنی تعلیمات ہیں، جن کا وہ بار بار مختلف پیرایوں میں برملا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اپنے دل کی آواز اور ضمیر کی خلوتوں میں اُبھرنے والے جذبے کو چھپاتے نہیں، بلکہ دوٹوک لفظوں میں وضاحت کرتے ہیں کہ قرآن کے بغیر ان کا فکر، شعر، فہم اور 'حرف' بے معنی ہے، وہ اللہ کے اس آخری پیغام کی روشنی میں انسانی دنیا کے مسائل و مصائب کا حل ڈھونڈتے اور انسانی قدروں کی بالا دستی کے لئے انسانیت کے خیر خواہوں کے افکار سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ اقبال کے فکر کا دوسرا اہم سرچشمہ سیرتِ نبویؐ ہے جس کی شفافیت اور صلابت کا اعتراف ہر مسلم و غیر مسلم کو ہے۔ اقبالؒ اپنے فکر کو اسی سرچشمۂ ہدایت سے فیض یاب کر کے دنیا پر اسکی عنایتوں، برکتوں اور نوازشوں کا شاعرانہ اور فلسفیانہ دونوں حیثیتوں میں ذکر کرتے ہیں اور موجودہ عہد پر یہ بات علی الاعلان واضح کرتے ہیں کہ محمدؐ رسول اللہ سے وفاداری ایمان کی علامت اور لوح و قلم پر گرفت حاصل کرنے کی شرط ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا؟ لوح و قلم تیرے ہیں

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شانِ نبیؐ نتواں شدن

عصر حاضر نے بہت سارے نظریات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اقتصادی، سماجی، معاشی اور سیاسی فلاح کے نئے نئے نقطہ ہائے نظر اور مسالک فکر اپنے مثبت اور منفی رویوں کے ساتھ

پیش ہو رہے ہیں، مگر تجربہ بتا رہا ہے کہ اپنی کجروی، بدگوہری، بے ضمیری اور ہوس رانی کے نتیجے میں یہ نظریات وقت کی رفتار کے ساتھ اپنی معنویت کھوتے رہے۔ ان کا کھوکھلا پن، روس، البانیہ، چیکوسلواکیہ، پولینڈ اور دیگر ممالک میں لوگوں کے سامنے اپنی اصل صورت میں آ گیا اور اقبالؒ کے نزدیک روس اور امریکہ انسانی زندگی کو خروج اور خراج کے بغیر کچھ دینے سے قاصر رہے اور انسان ان دو پتھروں (ملکوں) کے درمیان شیشے کی مانند چکنا چور ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیانِ ایں دو سنگ آدم زُجاج

انسانی دنیا اس وقت بچشمِ خود امریکہ کی صیہونی اور سامراجی ذہنیت کا نظارہ کر رہی ہے۔ توسیع پسندی اور جارحیت کے نشے میں افغانستان، عراق، شام اور ایران کے ساتھ امریکی جارحیت اپنے نقطۂ عروج پر آ پہنچی ہے۔ اور دیگر اقوام کو امریکہ اور اس کے حلیف تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرنے اور پامال کرنے کے سارے منصوبے ترتیب دے چکے ہیں۔ اقبالؒ کے خیال میں کفر ایک متحدہ قوت اور وفاق بنکر مسلم تہذیب اور ثقافت کو ختم کرنے میں اپنی عافیت و صیانت محسوس کرتا ہے اور اس کرب ناک صورت حال میں فکر اقبالؒ یک جہتی اور مسلم برادری میں یکرنگی و یکسوئی کی تحریک دیتے ہوئے یہ عالمگیر ملّی نغمہ سناتا ہے۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاکِ کاشغر

یا

زمانہ کہنہ بُتاں را هزار بار آراست

من از حرم نہ گذشتم کہ پُختہ بنیاد است

فکر، اقبالؒ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہے، اسکی گہرائی میں شعور، علم، تجربہ، دردمندی اور سوز و گداز کے ان گنت خزانے ہیں۔ جب بھی ایک سنجیدہ قاری اس سمندر میں غوطہ خوری کرتا ہے تو نئے گہر، اور نئے صدف اس کے ہاتھ آجاتے ہیں۔ یہ وہ بحرِ ناپیدا کنار ہے جس میں صدیوں کے وسیع مدت پر پھیلے ہوئے مدوجزر ہیں، تلاطم اور امواج کا ارتفاع ہے۔ کلامِ اقبال کو بنظرِ غائر پڑھ کے کبھی کبھار یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اپنی ذات میں ایک انجمن تھا، حیات و کائنات کے کتنے سربستہ رازوں کا ہمیں شریک بناتا ہے۔ فلسفہ کی سطح پر اقدار کی گفتگو ہے کلام کے توسط سے جذبات کی ایک بسیط فضا رقصاں ہے۔ مکاتیب اور شذرات کے تناظر میں جزئیات کے دفتر ہیں اور پھر شعر کو بہانہ بنا کر ناقۂ بے زمام کو منزل مقصود تک لے جانے کی ایک مسلسل تڑپ ہے۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

بیسویں صدی میں ابھرنے والی اقبالؒ کی متحرک، توانا اور تابندہ فکری شخصیت اکیسویں صدی کے پُر آشوب عالمی منظرنامے میں زبردست معنویت رکھتی ہے، یہ شخصیت اور یہ فکری وجود موجودہ صدی کو سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی بالادستی اور اقوامِ عالم پر ظلم و تعدّی، حق تلفی اور ناانصافی کے خلاف علم، بغاوت بلند کرتے ہوئے انسانی اخوت، احترام آدمیت متوازن تقسیمِ دولت، تزکیۂ قلب و ذہن اور ارتفاعِ اقدار کے عظیم اصولوں کی ترجمانی کا خوشگوار فریضہ انجام دیتا ہے۔

ان کا فکر محکوم و مظلوم انسانوں بالخصوص محنت کش طبقہ سے وابستہ لوگوں کو جھنجھوڑتا ہے اور انہیں ساحرِ الموط کے دیئے ہوئے برگِ حشیش کو ترک کر کے اپنی خودی کی شناخت اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی ترغیب دیتا ہے

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا ور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

آتش نوا شاعر اور صحافی...... آغا شورشؔ کاشمیری

دانائے راز کے حضور میں

ہندو پاک کے جن مایہ ناز انقلابی رہنماؤں نے میرے عنفوانِ شباب سے ہی مجھے بے حد متاثر کیا ہے، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خانؔ ،مولانا محمد علی جوہرؔ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، مولانا علی میاں ندوی اور آغا شورشؔ کاشمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ وہ انقلابی اور فولادی عزم کے سیاسی، ادبی اور دینی رہنما اور اصحابِ علم و دانش ہیں جن کی ذہانت و ذکاوت، شرافت و نجابت اور خطابت و صحافت کی بوقلمونیوں سے میرا ذہن، میری زبان اور میرا حافظہ مانوس رہا۔ میرے والد مرحوم خواجہ غلام حسن نحوی' ابوالکلام کے ''الہلال'' ظفر علی خان کے ''زمیندار'' اور شورشؔ کی ادارت میں چھپنے والے ''چٹان'' کے مستقل قاری تھے اور والد صاحب بخاری، ظفر علی اور شورشؔ کی ختمِ نبوت کے سلسلے میں تقاریر و تحاریر کا بکثرت ذکر کیا کرتے تھے۔ والد صاحب نے ایک بار سید عطاءؔ اللہ کے بارے میں ایک واقعہ سنایا تھا کہ ہندوستان ایک عالم مولانا عبداللہ درخواستی نے اپنے قیامِ مدینہ میں رسول اللہ کو خواب میں جلوہ گر پایا تھا۔ حضورؐ نے عبداللہ درخواستی سے فرمایا تھا کہ واپسی پر ہمارے فرزند سید عطاءؔ اللہ بخاری سے ہمارا اسلام کہنا اور یہ بھی کہنا کہ ہم آپ کے کام سے مطمئن ہیں۔ سبحان اللہ! یہ ہے ختم نبوت کے داعی کی عظمت۔ کالج کے ایام میں

شورشؔ کی ایک کتاب ''گفتنی و نا گفتنی'' دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کتاب کے انقلابی آہنگ سے میں اسقدر متاثر ہو گیا تھا کہ کتاب کا تقریباً نوے فیصد مواد میرے حافظے میں محفوظ ہو گیا جو خدا کے فضل و کرم سے آج تک برابر محفوظ ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ شورشؔ کے افکار اور بالخصوص سرورِ کونینؐ کے ساتھ ان کے عاشقانہ اور محبانہ جذبے نے مجھے ان کا شیدائی بنا دیا اور میں بار بار ان کے اشعار کے زیر و بم سے محظوظ ہوتا رہا۔

غریبِ شہر ہوں لیکن بلند بام ہوں میں
حضور سرورِ کونینؐ کا غلام ہوں میں
کسی حریف سے دبنا مرا شعار نہیں
بپاسِ جادہ و منزل خجستہ گام ہوں میں
مرا سلام نئی پود کے جوانوں کو
حکیم شرق کا ان کے لئے پیام ہوں میں
دل و دماغ کو بطحانے کر دیا مضبوط
محاذِ جنگ پہ شمشیر بے نیام ہوں میں
میں ایک روز مدینے ضرور جاؤں گا
بہ فیضِ سیدِ کونینؐ خوش مقام ہوں میں
شہنشہوں سے تعلق نہیں مجھے شورشؔ
خدا کا لطف و کرم ہے کہ نیک نام ہوں میں

شورشؔ کاشمیری کے شعری مجموعے گذشتہ پچاس برسوں میں مختلف ناموں کے تحت منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سال ۱۹۹۶ میں ان کا پورا کلام ''کلیاتِ شورشؔ کاشمیری'' کے نام سے

الفیصل ناشرانِ وتاجرانِ کتب اُردو بازار لاہور کے اہتمام سے چھپ کر آ گیا ہے۔ یہ کلیات اٹھارہ سوانیس صفحات پر مشتمل بسیار نویسی کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ ختمِ نبوت، سماجی وسیاسی حالات و واقعات، شخصیات، ذاتی واردات، تعلقات، فکاہات، طنزیات، شعریات اور اسلامیات سے متعلق ہزاروں عنوانات کے تحت شورشؔ نے اپنی جولانیِ طبع، ندرتِ بیان، قدرتِ کلام طاقتور ادراک واحساس اور تفکر ووجدان کا غیر معمولی مظاہرہ کیا ہے۔

سر بکف ہو کر نکل آیا ہوں میں
میں کسی غدّار سے ڈرتا نہیں
ہیچ ہیں میرے لئے دارورسن
تیغ کی جھنکار سے ڈرتا نہیں
کانپ اٹھتا ہوں خدا کے خوف سے
چرخِ کج رفتار سے ڈرتا نہیں
منبر و محراب سے آگاہ ہوں
جبہ و دستار سے ڈرتا نہیں
موت کیا ہے ؟ مردِ مومن کی اُمنگ
وہ کسی خوں خوار سے ڈرتا نہیں
شاعرِ مشرق کا پیروکار ہوں
یورپی افکار سے ڈرتا نہیں

شورشؔ کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہی اس بات کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کے زبردست مدّاح، خوشہ چیں اور ان کے عظیم افکار سے

بہت ہی مرعوب ہیں ۔ اقبالؔ کا نام جا بجا ملتا ہے، کہیں اقبالؔ کو جلالِ مشرق، حکیمِ شرق، شاعرِ اسلام، عاشقِ رسولؐ، دیوانۂ حجاز، درویشِ بے گلیم، قلندرِ عصر، داعیٔ خودی، نکتہ شناس اور محرم اسرارِ ایمانی کے الفاظ و القاب سے پکارتا ہے۔ شورشؔ کے جذبات کی پشت پر اقبالؔ کے ملّی تصورات کارفرما ہیں وہ کثرت کے ساتھ مولانا آزادؔ، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبالؔ کا ذکر عقیدت و احترام کے ساتھ کرتے ہیں ۔ حکیم احمد شجاع شورشؔ کے بارے میں ان حقائق کو بڑی دیانت داری کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں یوں قلمبند کر چکے ہیں ۔

''میں نے پچھلے ساٹھ ستر برسوں میں بڑے بڑے نامور خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں ۔ بڑے بڑے مشہور ادیبوں اور شاعروں کے رشحاتِ فکر کو پڑھا ہے، انکی زبان سے بھی سنا ہے اور بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ شورشؔ کی خطابت میں ابوالکلام کے خطبات کا رنگ منعکس پایا۔ اُن کے الفاظ میں ظفر علی خان کی طنز کو جھلکتے دیکھا اور ان کے جذبات میں اقبالؔ کے اسلامی تصورات کا پَرتَو پوری آب و تاب سے چمکتے پایا''۔

شورشؔ ''درویش بے گلیم کی اصطلاح کو عنوان بنا کر اقبالؔ کے افکار و نظریات اور ان کے مرتب کردہ اثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

اِک ابرِ نو بہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبالؔ اس چمن کی رگوں میں سما گیا
دل کا خروش ، عشق کا شعلہ نظر کی آگ
اپنے قلم کی گرم نوا سے بڑھا گیا
ضربِ کلیم اسکی نواؤں کا ماحصل
وہ یوں اٹھا کہ مشرق و مغرب پہ چھا گیا

شورشؔ مرے قلم کو دیا اذنِ انقلاب

اور خواجگانِ دہر سے لڑنا سکھا دیا

کلیاتِ شورشؔ کی جس کسی نظم کے سیاق وسباق کو ہم دیکھتے ہیں وہاں اقبالؔ کی فکر کے پرتو، ان کے احساس کی تابنا کی یا اقبالؔ کے کسی شعر کو ہی بنیاد بنا کر ایک نئی دنیا کی معرفت ہمیں نصیب ہو جاتی ہے۔ایک نظم کا عنوان ہی ''حکیم مشرق'' رکھا ہے۔زمانے کے جور وستم، رنج والم، یارانِ سخن کی پریشان حالی کے فوراً بعد مزارِ اقبالؔ پر اپنی حاضری اور ان کے مزار کو انقلابِ نو کا مرجع قرار دیکر شورشؔ یوں رقمطراز ہیں۔

ابھی تو ہے بجلیوں کی زد میں ہر ایک طائر کا آشیانہ

ابھی تو ہے چہرۂ چمن پر خشونتِ گردشِ زمانہ

ابھی تو دار ورسن پہ رہ رہ کے خونِ ناحق جھلک رہا ہے

ابھی تو یارانِ ہم سخن کے لئے مقدر میں ہے قید خانہ

ابھی تک حوّا کی بیٹیوں کا شباب بکتا ہے راستوں پر

ابھی تو زہرہ وشوں کی دوشیزگی ہے زیبِ شراب خانہ

عقیدت دل کے پھول لیکر چلا ہوں اقبالؔ کی لحد پر

کہ مرجعِ انقلابِ نو ہے حکیمِ مشرق کا آستانہ

''مری اسیری پہ شاخِ گل نے یہ کہہ کے صیاد کو رلایا

کہ ایسے پُر سوز نغمہ خواں کا گراں نہ تھا مجھ پہ آشیانہ

عقیدتِ اقبالؔ میں شورشؔ بسا اوقات اسقدر مستغرق نظر آتے ہیں کہ وہ تاریخ کی شخصیات کی فہرست میں اقبالؔ کو سرِ فہرست پا کر ان کے کلام کو تخیلی انداز میں جبرئیل امین کے بال و پَر کی

جنبش و حرکت قرار دیتے ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی اور فیض احمد فیضؔ کو غلامِ اقبالؔ کہہ کر ان دونوں بڑے شاعروں پر اقبالؔ کی برتری قائم کرتے ہیں۔

سرِ فہرست ہے تاریخ میں نامِ اقبالؔ
بالِ جبرئیل کی جنبش ہے کلامِ اقبالؔ
دین و اخلاق کے بازار کی رونق اس سے
دعوتِ خواجۂ گیہاںؑ ہے پیامِ اقبالؔ
رومیؔ و شبلیؔ و عطارؔ و جنید و حافظؔ
ان اکابر کے سفینوں میں ہے نام اقبالؔ
ایشیا پھر کبھی تقدیر کا شاکی نہ رہے
گر یہاں قائم و دائم ہو نظامِ اقبالؔ
جن کے افکار کی پرواز ہے لا دینی تک
پھانس لیتا ہے انہیں دانۂ دامِ اقبالؔ
جوشؔ کیا چیز ہے؟ اور فیضؔ کی حیثیت کیا ؟
شورشؔ اس دور میں دونوں ہیں غلامِ اقبالؔ

پاکستان میں احرار کی زیرِ قیادت ختمِ نبوت کی تحریک زور و شور کے ساتھ چلی اور اس میں اکابرین بھی شامل تھے۔ صحافتی، ادبی اور شعری میدان میں مولانا ظفر علی خان اور آغا شورشؔ کاشمیری اس تحریک کے اہم علمبرداروں میں سے تھے۔

توحید و رسالت کا علمدار تھا اقبالؔ
قرآن کی دعوت کا نگہدار تھا اقبالؔ

کلکتہ و لاہور سے طہران و نجف تک

آزادیٔ کامل کا خریدار تھا اقبالؔ

وہ مرشدِ دوران تھا بہر حال بہر کیف

جاروب کشِ احمدؐ مختار تھا اقبالؔ

شورشؔ کا اندازِ تحریر روایتی شعراء کے اسلوب تحریر سے بالکل علاحدہ ایک منفرد شان وشکوہ کا حامل ہے۔ ان کے کلام میں لالہ وگل، سنبل و یاسمن اور شبنم وصبا کی تراکیب کے ساتھ ساتھ ربیعہؔ جیسی خیالی محبوبہ کو بھی موضوع سخن بنایا گیا، لیکن عورت، جنس، محبوب، معشوق اور فراقؔ گورکھپوری کی امرد پرستی اور حسن نسوانی سے ''ہڈیوں کے پگھلنے'' کا ان کے یہاں ذکر نہیں ہے، بلکہ ظلم، سامراج، استبدادی قوتوں اور ملتِ مسلمہ کے دشمنوں سے بغاوت کا اعلان ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شورشؔ کاشمیری کی پوری شاعری رجزیہ یا رجزنامہ ہے۔ ظہیر کاشمیری نے انکی نظموں پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے بڑی پختہ بات کہی ہے۔ ''شورشؔ کی نظموں کا فنی اور فکری تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہر قسم کی ادبی ہیئتوں سے آراستہ کر چکے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں ایسی ہیں جن میں باندازِ غنا حرب وضرب کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس ضمن میں وہ خود لکھتے ہیں ۔

زبانِ ذوالفقار میں ڈھلی ہوئی ہے شاعری

غزل کی آب وتاب میں نوائے کارزار ہے

شورشؔ ایک مدت تک غیر ملکی استبداد کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں اور انہوں نے کئی بار تبریزؔ و منصورؔ کی روایتیں تازہ کی ہیں۔ اس لئے اپنی متعدد نظموں میں انہوں نے جنگی محاذوں کے کینوس سے نکل کر بین الاقوامی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔'' نظموں کے

عنوانات اوران کے مضامین فکرِ اقبالؔ کی رنگارنگی سے معمور ہیں۔ وہ کہیں براہِ راست اقبالؔ کے کسی خیال کو بنیاد بنا کر نظم، رباعی یا قطعہ تحریر کرتے ہیں یا اقبالؔ کی ہی زمین میں ایک دلنشین شعری فضا کو جنم دیتے ہیں ۔

ماضیِ مرحوم کے آثار کو آواز دو
دوستو! تاریخ کی رفتار کو آواز دو
مسلکِ اسلاف کی پرچم کشائی حبذا
جرأتِ قربانی و ایثار کو آواز دو
شاعرِ مشرق کلیمِ ایشیا
بالِ جبرائیل کے افکار کو آواز دو

جوشؔ ملیح آبادی کے بہت بڑے نظم گو شاعر اور الفاظ کے جادوگر ہونے میں دو رائیں نہیں، لیکن اپنی عظیم نظم نگاری اور بسیار نویسی کے باوجود وہ ہر صاحبِ اقتدار کا کاسہ لیس رہا اور اپنی آزادروی جدیدیت کو ادبی ارتقاء کا نام دیتا رہا۔ شورشؔ نے جہاں جہاں ان کا ذکر کیا، وہاں جوشؔ کی جاہ پرستی اور زر پرستی نمایاں ہو جاتی ہے۔ شورشؔ اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ان کے مشن کو توانائی اور قوت عطا کرنے میں مسلک حبِ نبیؐ اور آلِ بوتراب ؓ کا بڑا حصہ ہے لیکن جوشؔ مداح اہلِ بیت تو ہے مگر شورشؔ کی نگاہِ حق پرست میں وہ یزید کے دربار کا شاعر اور شاعرِ مشرق کے دشمنوں سے ملا ہوا ہے۔ ایک نظم ''جوش ملیح آبادی کو خوش آمد کی ایک مجلس میں دیکھ کر'' کے عنوان سے جوشؔ کا مرقع یوں پیش کیا ہے۔

جوشؔ جام و شراب کا شاعر
جوشؔ حسن و شباب کا شاعر

جوشؔ برقِ ہوس کا کڑکا ہے
جوشؔ اسّی برس کا لڑکا ہے

جوشؔ کو اس چمن سے نسبت کیا
اسوۂ پنجتنؑ سے نسبت کیا

بادۂ زر رنگار کا ساتھی
ہر نئے اقتدار کا ساتھی

ہرحکومت کی نوکری کی ہے
عمر بھر اس نے چاکری کی ہے

بارگاہِ یزید کا شاعر
منفعت کے رموز کا شاعر

کیسۂ زر جہاں تہاں ہو گا
جوشؔ کو ڈھونڈیئے وہاں ہو گا

آخری عمر میں زوال اس کا
وائے افسوس ارتحال اس کا

جدید شعری منظر نامے میں روایت اور جدت کا سنگم تلاش کر لینا تنقید کا فیشن سا ہو گیا ہے۔ لیکن کسی کو یہ سنگم دیکھنا ہی ہے، شورشؔ کاشمیری کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیئے ۔مترنم بحروں اور مشکل زمینوں میں احساسات کو چھو لینے والے اشعار شورشؔ کی کلیات میں جا بجا نظر آئیں گے۔ جذبہ کی تیز آنچ کو شورشؔ حد سے تجاوز کرنے سے بھی روکتا ہے۔ اس کے کلام میں پاسبان عقل دل کو تنہا چھوڑتا بھی ہے تو بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتا۔ خیالات کی

پاکیزگی، فکر کی شائستگی، جذبے کی لطافت اس کے اشعار کی غذا ہیں۔ الفاظ کی خوش انتخابی اور ترتیب وتہذیب نے کلام میں چستی، اور روانی کے ساتھ موسیقیت پیدا کر دی ہے۔ تجربات و مشاہدات کی وسعت، نظر کی بلندی، فکر کی گہرائی، فن کی تازہ کاری، اِحقاق حق اور اِبطال باطل کی گھن گرج اس کے اشعار کی دلنوازی میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہے۔

کیا ہیں سحر وشام، میں اس فکر میں گم ہوں
اے وقت مجھے تھام، میں اس فکر میں گم ہوں

ہر آن غریبوں پہ حوادث کی ہے یلغار
ہر سمت ہے کہرام، میں اس فکر میں گم ہوں

انسان کا خوں بادۂ گلگوں ہے تو کیوں ہے ؟
اے گردش ایام ، میں اس فکر میں گم ہوں

محصور ہے نا فہم مغنّی کی نوا میں
اقبالؔ کا پیغام ہے میں اس فکر میں گم ہوں

☆☆☆
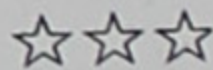
دورِ جدید میں فکرِ سعدی شیرازی کی معنویت وافادیت

ایران صدیوں سے اپنی تہذیب، ثقافت، زرخیزیت اور ادبی عظمت کی بنا پر انسانی دانشوری کی تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت کا حامل بُقعۂ اَرضی رہا ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح، وسطی ایشیا سے آئے ہوئے آریاؤں نے اسکو آباد کیا ہے اور اسی مناسبت سے ایران نام پڑا۔ بحیرۂ کسپین کے جنوب اور خلیجِ فارس کے شمال میں واقع اِیران اپنی مَردم خیزی اور موسم کی دلآویزی کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے تہران کے علاوہ مشہد، اصفہان، اَہواز، کرمان، قُم، تبریز، اور شیراز اس ملک کے اہم ترین شہر ہیں۔ پھولوں اور بلبلوں کے شہر شیرآز سے ہی حضرتِ سعدی شیرازی کا تعلق تھا، چنانچہ پورے کرّۂ ارض پر سعدؔی کے نام کی وجہ سے ہی یہ شہر، شہرت ومقبولیت کی بلندیوں پر واقع ہے۔

خاکِ پاکِ وطن ہے مردم خیز
یہی شیرآز ہے یہی تبریزؔ

سعدی کا اصل نام شیخ مصلح الدین تھا اور شیراز انکی جائے پیدائش تھی۔ سعدی ۱۱۷۵ میں تولّد ہوئے اور ۱۲۹۲ میں انتقال کر گئے۔ زندگی کے تیس سال دنیا کے مختلف شہروں، دیہاتوں، دُشوار ترین برّی اور بحری گذرگاہوں کے سفر میں گذارے۔ ہر طبقۂ فکر کے انسانوں کی محفلوں اور عبادت گاہوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ چودہ بار ننگے پاؤں مکّۂ مکرمہ کا سفر کیا۔ ابنِ بطوؔطہ کے بعد سعدؔی دنیا کا سب سے بڑا سیاح گذرا ہے، اور وسیع وعریض سیاحت اور مسافرت کے بعد

مختلف موضوعات پر اکیس کتابیں تحریر کیں، جن میں دو کتابوں ''گلستان وبوستان'' کو عالمی شہرت نصیب ہوئی۔ سفر کے دوران انہوں نے بے شمار تکلیفیں بھی اُٹھائی ہیں، خاص طور پر بحیرۂ روم، بحیرۂ قلزم بحیرۂ عرب اور بحرِ ہند کے سفر میں ذہنی اور جسمانی مشقتوں، بھوک اور پیاس کے جاں لیوا مرحلوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

در اقصائے عالم بگشتم بسے

بسر بردم ایام با ہر کسے

تمتع زہر گوشۂ یافتم

زہر خرمنے خوشۂ یافتم

ترجمہ:۔ میں دنیا کے اَطراف واکناف میں بہت گھوما پھرا۔ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ میں نے وقت گذارا۔ میں نے ہر گوشے سے فائدہ اٹھایا اور ہر انبار سے خوشے چُن لیے۔

سعدیؔ شیرازی کی ادبی، فکری اور دانشورانہ صلاحیتوں کا یہ کرشمہ تھا کہ اگلے وقتوں میں دنیا کے کروڑوں طالب علموں اور فارسی زبان پڑھنے والوں کی تعلیم اور زبان دانی گلستان اور بوستان کے بغیر ادھوری تصور کی جاتی تھی۔ یہ دو کتابیں ہزاروں علماءؑ کے حافظے میں حرف بہ حرف محفوظ تھیں اور آج بھی علاّمہ سعدی کے نثری جملے اور اَشعار بطورِ ضرب الامثال کے پیش کئے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار اور یہ جملے، عرب وعجم میں زبان زدِ عام وخاص ہیں

خرِ عیسیٰ اگر بہ مکّہ اور

چوں بیاید ہنوز خر باشد

ترجمہ:۔ حضرت عیسیٰؑ کا گدھا اگر مکّہ شریف چلا جائے، جب وہ واپس لوٹتا ہے وہ گدھا ہی ہو گا، مراد یہ ہے کہ تعلیم وتربیت فطری صلاحیت کے بغیر نامکمل اور بے اثر ہے۔

سال ہا سال بر تو بگذر د کہ بگذار

نہ کنی سوئے تربتِ پدرت

تو بجاے پدر چہ کر دی خیر

تاہماں چشم داری از پسرت

ترجمہ:۔سال ہاسال گذر جاتے ہیں کہ تو باپ کی قبر کے پاس سے نہیں گذرتا۔تو نے اپنے باپ کے ساتھ کیا بھلائی کی ہے کہ تو اپنی اولاد سے اسکی توقع رکھتا ہے،

ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شُد

ترجمہ:۔جونمک کی کان میں گیاوہ نمک ہی ہو گیا

گر نہ بیند بروز شپرّہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ترجمہ:۔اگردن کے اجالے میں چمگادڑ نہ دیکھ سکے تو اس میں سورج کی آنکھ کا کیا قصور ہے۔

اخلاقی تربیت' اعلیٰ انسانی صلاحیت اور صحبت کے اثرات کی مثالوں اور ذاتی تجربوں کے حوالے سے جائزہ لیا ہے' دلچسپ اور نصیحت آموز کہانیوں کے ذریعے وہ زندگی کے حقائق کا پردہ بڑی دانشمندی سے اٹھاتے ہوئے' اپنے زمانے اور آنے والے وقتوں کے لیے نصیحت و عبرت کا ایک بیش بہا خزانہ لفظ و معنی کے سانچے میں محفوظ کرتے ہیں.۔سعدیؔ حکمرانوں کو آداب سلطنت کے راز بتاتے ہوئے اُنہیں عدل و انصاف کی تاکید کرتے ہیں۔وہ احسان اور خیر کے توسُّط سے دلوں کی دنیا مسخر کرنے کی بات کرتے ہیں۔وہ قناعت اور کفایت شعاری کے فائدے گردانتے ہیں۔وہ کم گوئی اور خاموشی کے فائدوں سے انسانی دنیا کو باخبر کرتے ہیں۔ وہ اچھی تربیت کے لیے ذہن اور زمین ہموار کرنے کے سلسلے میں حسد' پندار' نخوت' گھمنڈ اور نفسِ امارّہ کی برائیوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔وہ دنیا پرست انسانوں پر مسلسل

وار کرتے ہوئے انکی ہوس رانی کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔

آں شنیدستی کہ در صحرائے غور
باد سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشمِ تنگ دنیا دار را
یا قناعت پُر کند یا خاکِ گور

ترجمہ:۔تم نے سنا ہوگا کہ ایک بار غور کے صحرا میں ایک مالدار خچر (سواری) سے گر پڑا۔اس نے بے کسی کی حالت میں کہا کہ دنیا دار کی لالچی آنکھ کو یا قناعت بھر سکتی ہے یا قبر کی مٹی"۔

سعدی کی دو شہر آفاق کتابوں گلستان اور بوستان کا ایک ایک جملہ نصیحت، بصیرت اور بصارت کا آئینہ دار ہے۔سماج کو حقیقی معنوں میں ایک انسانی سماج کا وجود بخشنے اور اس کے ہر شعبے کو اخلاقِ حمیدہ کے زیور سے آراستہ کرنے کی سعدی نے ہر سطح پر کوشش کی ہے۔سعدی کا ذہنی کینوس (دائرہ) انگریزی کے معروف شاعر اور ڈرامانویس ولیم شیکسپیر سے کئی گنا بڑا اور بسیط لگ رہا ہے۔جہاں بینی اور انسانی زندگی کا گہرا تجربہ جو سعدی شیرازی کو میسّر ہوا اس کا عشرِ عشیر بھی شیکسپیر کو نصیب نہیں ہوا۔کنگ لیئر، میکبتھ، ہیملٹ اور رومیو جولیٹ کی بدولت شیکسپیر عالمی شہرت پا گیا ہے اور اس کے پس منظر میں انگریزی زبان کی توانائی بھی موجود تھی، لیکن سعدی چونکہ فارسی کا سخنور تھا، اسکو وہ پذیرائی اور عزت افزائی نہ ملی، جس کا وہ مستحق تھا۔

سعدی کو قدرت کی طرف سے گہرا شعور اور باریک نظر عطا ہوئی تھی، مگر قدرت کبھی کبھار ذہین لوگوں کو کسی پریشانی میں بھی ڈال دیتی ہے ایسا ہی معاملہ سعدی کے ساتھ بھی ہوا کہ جب اسے ایک بار جیل میں ڈال دیا گیا تو ایک صاحب نے اسے رہا کروایا اور اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دی۔وہ اس قدر تند مزاج تھی کہ سعدی نے ایک بار یہاں تک کہا کہ "قید میں

رہنا میرے لیے بہتر تھا بہ نسبت اس بدمزاج خاتون کے جس نے میرا قافیۂ زندگی تنگ کردیا ہے"۔

سعدی معاشرتی زندگی میں پرانے وقتوں کی تہذیبی اور ثقافتی روایتوں کو قائم رکھنے اور یادِ رفتگاں کو تازہ کرنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے کئی حکایتیں لکھی ہیں اور مثالوں سے اچھی روایات کو برقرار رکھنے کا جواز پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک بار سکندر روم سے پوچھا گیا کہ مشرق و مغرب کے بہت سارے ممالک تو نے کیسے فتح کیے حالانکہ تجھ سے پہلے گذرے ہوئے بادشاہ شکر، دولت اور خزانوں کے اعتبار سے تجھ سے بڑھے ہوئے تھے۔ لیکن ان کو اتنی "بڑی فتوحات" نصیب نہ ہوسکیں۔ سکندر نے جواباً کہا "جو بھی ملک میں نے فتح کیا وہاں کے باشندوں کو نہ ستایا اور گزرے ہوؤں کی اچھی رسموں کو منسوخ نہیں کیا"۔

؎ نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نامِ نیکت برقرار

ترجمہ:۔ جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے ان کے اچھے نام کو برباد نہ کرنا تاکہ تیرا نیک نام قائم رہے۔

مردانِ خدا کی بے باکی اور غیرت و حمیت کے حوالے سے سعدیؒ نے ایک درجن سے زائد واقعات قلمبند کیے ہیں۔ واقعات بیان کرنے کا مقصد قاری کے دل میں فقط خدا پرستی کا جذبہ موجزن کرنا ہے اور یہ کہ مردِ حق پرست کبھی دولت یا سلطنت کے دبدبے سے مرعوب نہیں ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں "ایک دفعہ ایک خدا پرست آدمی جنگل کے ایک گوشہ میں بیٹھا اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ وہاں سے بادشاہ کا گذر ہوا۔ عابد نے اسکی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بادشاہ بگڑ کر کہنے لگا کہ یہ خرقہ پوش جانور ہوتے ہیں، انکو انسانیت چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ بادشاہ کے تیور دیکھ کر ایک وزیر اس کے پاس گیا اور درویش سے کہا۔ اے مرد خدا ایک بہت بڑا بادشاہ یہاں سے

گذرا تو نے اسکی خدمت نہ کی اور آداب بجا نہ لائیے۔ درویش بولا۔ بادشاہ سے کہہ دو کہ خدمت کی امید اس سے رکھے جو اس سے انعام کی توقع رکھتا ہو اور یہ بھی وہ سمجھ لے کہ بھیڑ چرواہے کے لیے نہیں ہے' بلکہ چرواہا اسکی خدمت اور حفاظت کے لیے ہے۔ بادشاہ کو فقیر کی یہ باتیں بھلی محسوس ہوئیں اس نے فقیر سے کہا کہ مجھ سے کچھ مانگیے۔ فقیر نہ کہا میں یہ مانگتا ہوں کہ آپ یہاں دوبارہ تشریف لا کر مجھے تکلیف نہ پہنچائیں۔ بادشاہ نے کہا تو پھر مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ درویش بولا

دریاب کنوں کہ نعمت ہست بدست
کیں دولت و ملک میرود دست بدست

ابھی مہلت ہے کہ کچھ کر لے کیوں کہ نعمت ابھی تیرے ہاتھوں میں ہے یہ ملک و دولت ہاتھوں ہاتھ جاتا ہے۔

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات کارِ جہاں ثبات

اپنی طویل سیاحت کے دوران سعدی کی ملاقات کوہستانی دروں' جنگلوں اور بیابونوں میں رہنے والے بزرگوں سے ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے ملفوظات اور اقوال کا نچوڑ اشعار کے سانچوں میں ڈھال دیا ہے۔ ایک حکایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شہرت و ناموری تب تک بے معنی ہے جب تک نہ اخلاص عمل موجود ہو۔ "مجھے معلوم نہیں کہ پہاڑی بابا نے اس شخص سے کیا کہا جو شہرت کی خاطر عبادت کرتے کرتے ساری رات نہیں سویا۔ پہاڑی بابا نے اس سے کہا' جا اخلاص پیدا کر' اس لیے کہ تو مخلوق سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ جنہوں نے تیرا فعل پسند کیا ہے انہوں نے ابھی تیرے ظاہری نقش دیکھے ہیں۔ حُور جیسا غلام کیا قدر پیدا

کرسکتا ہے جو پیرہن کے نیچے برص کا جسم رکھتا ہو۔ مکاری سے بہشت میں جانا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ تیرے بھدے چہرے سے چادر ہٹ جائے گی''۔

اس بات پر اکثر ماہرین تعلیم کا اتفاق ہے کہ جب تک اسکولوں کے نصاب میں سعدی کی اخلاقی اور سبق آموز حکائتیں شامل تھیں، طلبہ کی مجموعی اخلاقی حالت بہتر تھی۔ احترام، پاس و لحاظ، دیانت اور معاملات میں کسی حد تک پاکیزگی کا عنصر موجود تھا۔ جب سے ہمارے موجودہ نظام تعلیم اور نظامِ معاشرہ میں یہ دو کتابیں غائب ہوگئیں یا ایک منصوبے کے تحت غائب کر دی گئیں، تب سے ماہرین محسوس کررہے ہیں کہ اخلاقی زوال کی رفتار بڑھ رہی ہے، جرائم نئے روپ دھار رہے ہیں اور سماجی قدروں کا تانابانا ٹوٹتا نظر آرہا ہے۔ اخلاقی باتیں اور سبق آموز حکایتیں رومیؒ، سنائیؒ، جامیؒ اور فردوسی نے بھی کی ہیں، ان میں بھی کہیں زیادہ اور کہیں کم تاثیر موجود ہے، لیکن جس اعلیٰ پایہ کی ادبی زبان اور حکیمانہ اسلوب میں سعدی نے وہی باتیں بیان کی ہیں۔ اس کا اپنا انداز، اپنا ایک منفرد اثر اور کشش موجود ہے۔ یورپ میں رومیؒ، سعدیؒ، نظیری اور اقبال کے ترجمے منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان شعرأ کے انسانی، روحانی اخلاقی اور تاریخی بیانات وکلمات کو ترجموں کے ذریعے پڑھا اور سمجھا جارہا ہے۔ فکرِ سعدی شیرازی کی معنویت اسکی عالمگیر ناصحانہ حیثیت کے سبب بڑھتی جارہی ہے کیونکہ سعدی کے افکار زمانے کی فکر کے اس پہلو کو ابھارتے ہیں، جن سے صلح و امن، انسان دوستی، محبت اور رواداری کے جذبے کو فروغ ملتا ہے۔ جو خود بینی، بد بینی اور بدعہدی کے بجائے جہاں بینی، جہاں دوستی اور ایفائے عہد کے بڑے اصولوں پر قائم ہے۔ سعدؔی کے عالمگیر فکری نظام میں انسان کو اولاً انسان اور آخر میں بھی بحیثیت انسان کے ہی اہمیت ہے، عقائد اور افکار کی رنگارنگی ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ صحبتِ صالح اور صحبتِ طالح کے نظریے کی ایک اہمیت ہے۔ اپنی تمام تر

فصاحت و بلاغت، ندرتِ بیان، حسنِ تعلیل اور کمالِ درجے کی ادبی چاشنی کے باوجود انکساری کا اظہار اس عظیم سخنور نے "بوستان" کے ایک ابتدائی عنوان "سببِ تالیف کتاب" میں یوں کہا ہے

نازم بسرمایۂ فضل و خویش بدریوزہ آوردہ ام دستِ خویش
شنیدم کہ در روزِ امید و بیم بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم
تو نیز ار بدے بینیم در سخن بخُلق جہاں آفرین کارگُن
چو بیتے پسند آیدت از ہزار بمردہ کہ دست از تعنّت بدار
چو خرما بشیرینی اندادہ پوست چو بازش کنی استخوانے از وست

ترجمہ:۔اپنی بزرگی اور دانائی پر مجھے ناز نہیں ہے۔ بھیک کا ہاتھ میں نے آگے بڑھایا ہے میں نے سنا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نیکوں کے ساتھ بدوں کو بھی بخشے گا۔ تو بھی اگر میرے کلام میں کوئی نقص دیکھے گا، تو دنیا پیدا کرنے والے کے اخلاق سے کام لے۔ اگر ہزار میں ایک شعر بھی تجھے پسند آ جائے تجھے اپنی جوانمردی کی قسم، عیب جوئی سے ہاتھ اٹھائے۔
ڈھول کی آواز کی طرح میرا شہرہ دور سے تھا۔ گٹھری میں میرا عیب چھپا ہوا تھا۔ چھوارے کی طرح چھلکا شیرینی سے بھرا ہے، جب تو اسے چھیلے تو اس میں گٹھلی ہے۔

☆☆☆
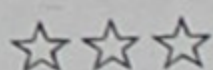
شاعرِمشرق کا تخلیقی شاہکار......زبورِ عجم

اقبال کے جملہ شعری مجموعے اپنے اندر محسوسات اور تجربات کی تمام توانائیوں کو سمیٹے ہوئے اور ایک سے ایک بڑھ کر فکر وفن کے محاسن کے ساتھ جادۂ ادب کے رہروؤں کو لذت ومسرت فراہم کرتے ہیں۔ شعرِ اقبال پڑھکر انسان تصوّرات کی ان بلندیوں تک جا پہنچتا ہے، جہاں سے کائنات کے اسرار ومعارف، اسکی تخلیق، اس کے مقاصد، اور انسان کے وجود کی سربستہ حقیقتوں کا احساس وادراک ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس زبورعجم کے مطالعہ سے نئی شکل وصورت اختیار کرلیتا ہے۔

''زبورعجم'' کی غزلیں اور نظمیں پڑھکر آدمی کسی اور مقام، کسی اور منزل، کسی اور کیفیت میں داخل ہوجاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود اقبال نے اپنی اس فارسی تصنیف کا تعارف ایک اُردو غزل کے اس شعر سے کرایا ہے۔

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

زبورعجم ایک سوچھپن غزلوں، دو مثنویوں اور چند نظموں پر مشتمل ایک تخلیقی شاہکار ہے۔ جس میں غنائیت، رنگارنگی، سوز وگداز اور وفورِ شوق کی فراوانی موجود ہے۔ ''عشق'' کا لفظ بھی بار بار شدید محبت، ایمان، جذبۂ قربِ الٰہی، تعلق باللہ اور قرآن کے الفاظ میں اَشَدُّ حباً للہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اقبال سے پہلے اُردو فارسی کے اکثر وبیشتر

شاعروں نے لفظ ''عشق'' کو تعلق نسوانی، محبتِ مجازی، غم جانان تک مقید کیا تھا اور ایک ایسا معیوب لفظ بنا دیا تھا کہ اس کے استعمال سے ثقہ علمائے دین ہمیشہ احتراز برتتے تھے۔ اس لفظ کو پہلی بار اُردو اور فارسی شاعری میں تقدیس و توقیر اقبال نے فراہم کیا، اسی طرح جیسے غزل عمومی طور پر عورتوں سے باتیں کرنے اور حسنِ نسوان کی تعریف و توصیف تک سمٹ چکی تھی چنانچہ اقبال نے صنفِ غزل کو بھی مردانہ لب ولہجہ عطا کیا۔ اور اس میں حیات وکائنات کے مسائل کو جگہ دے دی۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ادب سے وابستہ بہت سارے بادہ نوش اقبال کے رنگِ تغزل کی تضحیک کرتے ہیں اور اسے میرؔ و غالبؔ کے معیارِ غزل گوئی سے انحراف سمجھتے ہیں۔ اپنی نجی محفلوں، شراب نوشی اور قمار بازی کی نشستوں میں اقبال کے نظامِ فکر و نظر پر فقرے کستے ہیں۔

؎ اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

اس معرکتہ الآرا کتاب کی شروعات ایک دعا سے ہوتی ہے۔ لیکن دعا سے پہلے کتاب پڑھنے والے سے تین شعروں پر کامل تفکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

؎ می شود پردۂ چشمم پرِ کاہے گاہے
دیدہ ام، ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادیِ عشق بسے دور دراز است ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے
در طلب کوش مدہ دامنِ امید ز دست
دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے

ترجمہ:۔کبھی کبھار تو ایسا ہوتا ہے کہ گھاس کا ایک تنکا میری آنکھوں کے لیے پردہ بن جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ میں نے دونوں دنیا کو ایک نظر سے دیکھا ہے۔ عشق کی وادی بہت لمبی ہے۔لیکن بعض مرتبہ ایک آہ میں سو سال کی مسافت کا راستہ طے ہوتا ہے۔اے (زبور) پڑھنے والے تو بھی راہ حق کی تلاش میں کوشش کر اور امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دے۔ یہ عشق ایک ایسی دولت ہے جو کبھی یوں ہی راہ چلتے ہاتھ لگ جاتی ہے۔یعنی کسی مردِ کامل کی رہنمائی سے یہ دولت حاصل ہوسکتی ہے۔

عموماً لوگ جب دعا مانگتے ہیں تو اس میں رزق کی کشادگی، عمر میں برکت اور دولت میں فراوانی کا بکثرت ذکر ہوتا ہے لیکن زبور عجم کی دعا مختلف بھی ہے اور بارگاہِ ایزدی میں کسی اور شے کی متلاشی ہے۔

؎ یارب درونِ سینہ دلِ باخبر بدہ

در بادہ نشہّ رانگرم آں نظر بدہ

ایں بندہ راکہ بانفسِ دیگراں نزیست

یک آہِ خانہ زاد مثالِ سحر بدہ

خاکم بہ نورِ نغمہَ داوٗد برفروز

ہر ذرہَ مرا پرِ وبالِ شرر بدہ

ترجمہ:۔اے اللہ میرے سینے میں ایک باخبر دل رکھیے اور مجھے ایسی نظر عطا ہو کہ میں شراب (معرفت) کے اندر موجود نشہ کو دیکھ لوں۔اے اللہ اپنے اس بندے کو جس نے دوسروں کے سہارے زندہ رہنا پسند نہیں کیا صبح کی مانند ایک مخلصانہ آہ عطا کر۔تو میری مٹی کو داوٗدؑ کے نغمے کی روشنی سے چمکا دے اور میرے ہر ذرّے کو چنگاری کے پر و بال نصیب کر دے۔

''زبورِ عجم'' میں موضوعات کا تنوع جا بجا موجود ہے۔ یہاں بھی مختلف مقامات پر اقبال ایک ایسے درویش، قلندر، مردِ مومن اور مردِ کامل کا مرقع پیش کرتا ہے جس میں ظلم و جبر، اِستبداد، اِستحصال اور باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراو کا ارادہ موجود اور موجزن ہو۔ خیر اور شر، حق اور باطل کی معرکہ آرائی ہر دور ہوئی ہے۔ مگر اقبال ہمیشہ خیر اور حق سے وابستہ قوتوں اور شخصیتوں کو سراہتے ہیں اور مفادات کے بندوں کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں۔

بانشہٴ درویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن
گفتند جہانِ ما آیا بتومی سازد
گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

ترجمہ:۔تو درویشی کے نشے سے ہم آہنگی پیدا کر اور اسے مسلسل پیتا رہ۔ جب تو پختہ ہو جائے تو پھر جمشید (بادشاہ) کے اقتدار سے ٹکر لے لے۔ یعنی حقیقی درویشی سے ہی تجھ میں بڑی طاقتوں کے ساتھ لڑنے کی ہمت پیدا ہو سکتی ہے۔ قدرت کی طاقتوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا یہ ہماری دنیا تجھ سے موافقت کرتی ہے میں نے کہا کہ نہیں یہ دنیا موافقت نہیں کرتی ہے، تو اس پر انہوں نے کہا کہ پھر اسے درہم برہم کر دے۔ یعنی اس دنیا کو ایک انقلاب سے دوچار کر۔ یہ اور اسی نوعیت کے انقلابی خیالات ، ہنگامہ آرا تصورات ونظریات زبورِ عجم میں بکثرت موجود ہیں۔ کائنات کی ساخت، اس کی منصوبہ بندی اور اس میں کیا کیا امکانات موجود ہیں اس پر اقبال غور وفکر کرتے ہوئے خالقِ کائنات کی عظمت وجلالت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہے کہ انسان کے علم وفہم سے یہ سارے حقائق پوشیدہ کیوں ہیں۔ ایک غزل میں اسی قسم کے تصورات کا اظہار کرتے ہو

ئے اچانک ادراکِ رازیؔ اور بازوئے حیدریؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رازی کی عقل ودانش کے مقابلے میں قوتِ حیدریؓ کو حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہئے، اِسی میں تیرا فائدہ ہے۔

من از کارآفریں داغم کہ باایں ذوقِ پیدائی
زما پوشیدہ دارد شیوہ ہائے کارسازی را
بہرنرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد
بزورِ بازوئے حیدرؓ بدہ ادراکِ رازیؔ را

''زبورِ عجم'' میں اقبال نے دو مختصر مثنویاں بھی شامل کی ہیں۔ پہلی مثنوی گلشن راز، جدید ہے۔ یہ سعدالدین محمود شبستری کے منظوم رسالے ''گلشن راز'' کا جواب ہے۔ شبستری کو خراسان کے ایک صوفی بزرگ امیر سید حسینی نے مسائلِ تصوف کے حوالے سے پندرہ سوالات بھیجے تھے۔ یہ سبھی سوالات منظوم تھے۔ چنانچہ شیخ محمود شبستری نے ان سوالات کے جوابات بھی نظم میں ہی تحریر کئے، اور اس میں تصوف کے حقائق ومعارف کا نہایت ہی آسان انداز میں وضاحت کی گئی ہے۔ محمود شبستری کے اس رسالے کو کئی صدیوں تک تصوف کے ضمن میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اقبال نے پندرہ میں سے گیارہ سوالات کو چن کر جدید فکر ودانش کی روشنی میں تصوف کے مقاصد سے بحث کی ہے۔ چنانچہ شبستری کے یہاں جو جوابات کی ترتیب ہے۔ اقبال نے اس میں تقدیم وتاخیر کی ہے، اور شبستری کے صوفیانہ لب ولہجے کے برعکس اقبال نے انقلابی آہنگ اختیار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

گذشت از پیش آں دانائے تبریز
قیامت ہا کہ رست از کشت چنگیز

نگاہم انقلابے دیگرے دید

طلوعِ آفتابے دیگرے دید

ترجمہ:۔تبریز کے دانا محمود شبستری کے سامنے وہ قیامتیں قائم ہوئیں جو چنگیز خان کی کھیتی سے اگیں، میری نگاہوں نے ایک اور طرح کا سورج طلوع ہوتے دیکھا ہے۔

اقبال کے جوابات میں عرفانِ ذات، خود آگہی، خودی، خودگیری اور جدوجہد حیات پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ جبکہ شبستری کے جوابات فکر و نظر کی دنیا تک محدود ہیں۔ شبستری کا انداز روایتی ہے جبکہ اقبال نئے عالمی منظر نامے میں جدت اور جدیدیت کے ساتھ بات کرتا ہے۔

؎ خودی چوں پختہ گردو لازوال است

فراقِ عاشقاں عینِ وصال است

وجودِ کو ہسار ودشت و دریچ

جہاں فانی خودی باقی دگر ہیچ

دگر از شنکرؔ و منصورؔ کم گوی

خدا راہم براہِ خویشتن جوی

بخود گم بہرِ تحقیقِ خودی شو

انا الحق گوے وصدیق خودی شو

زبور کی ایک فکر انگیز نظم ''بندگی نامہ'' ہے۔ جس میں غلام قوموں کے فنون لطیفہ مصوّری، صناعی اور موسیقی پر زبردست تنقید کی گئی ہے۔ اور اس کے مقابلے میں آزاد قوموں کے فکروفن کو سراہا گیا ہے۔ ''بندگی نامہ'' کی تمہید چاند کے شکوے سے ہے۔ چاند

خدا کے حضور یہ عرض کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے اس خطّے کو روشن کرنے پر مامور کیا ہے، جو غلامی سے دغدار ہے جہاں انسان خدا کو نہیں دوسری قوتوں کو پوجتے ہیں۔ یہ کرۂ ارضی ذاتِ خداوندی سے آشنا نہیں۔ اے خدا اسے فضائے بسیط میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے اور ہم نوری قوتوں کو اسے روشن کرنے کی زحمت سے آزاد کر دے۔

خاکدانے با فروغ و بے فراغ
چہرۂ او از غلامی داغ داغ
ایں جہاں از نورِ جاں آگاہ نیست
ایں جہاں شایانِ مہر و ماہ نیست

مجموعی طور پر زبورِ عجم اقبال کے عظیم تصورات کا ایک دلکش مرقع ہے اور ان کی فارسی زبان وادب کے مزاج سے کامل واقفیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

گردشِ لیل و نہار

انسانی دنیا کا منظر نامہ بدل رہا ہے

کائنات کی تخلیق کا آغاز کب اور کیونکر ہوا اس معمّہ اور پیچیدہ مسئلہ کی گرہ کشائی میں مفکّروں
'مدبروں' سائینس دانوں علوم تنجیم کے ماہروں اور انکشافات و اکتشافات کے علمبرداروں کو
ہزار ہا سال سے ذہنی ریاض اور تفکّر کی راہوں پر گذر کر بالآخر یہ کہنا پڑا کہ ''یہ صبح کہاں سے
شروع ہوئی اسکی تخلیق کہاں پر ہوئی ہے' یہ ابھی تک سربستہ راز ہے''

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وقت کے بارے میں اسلام' فلسفیوں' دہریوں اور دانشوروں کے نظریۂ زماں و مکاں سے
ایک مختلف حرکی' اور تغیر پذیر تصوّر پیش کرتا ہے' جو وحی و الہام اور کشف و وِجدان کی اساس پر
قائم ہے۔ لیل و نہار کے اختلاف اور گردش میں عقل والوں کے لیے نشانیاں موجود ہیں۔ جو
لوگ صبح و شام کے الٹ پھیر پر غور و فکر کرتے ہیں' ان کو وقت کی صحیح حقیقت معلوم ہو جاتی
ہے۔ وقت دراصل لمحات و آنات کے ایک تسلسل کا نام ہے' جس کی ابتدا اور انتہا کے حقائق
انسانی فہم سے بالاتر ہیں۔ اسلام کی فلسفیانہ توجیہہ کے حوالے سے علماً کا ایک طبقہ وقت اور
کائنات کو واقعات کا سرچشمہ قرار دیتے ہوئے تغیر و تبدُّل کو زندگی اور تخلیق کی روح تصور
کرتے ہیں۔ تجربات و مشاہدات کی انتہا نہ تو مکانی ہے اور نہ حالتِ زمانی' اور نہ عناصرِ

اشیأ بلکہ وہ بذاتِ خود واقعات ہیں۔ زمان و مکان، جو ہر یا زندگی واقعات کے نظریاتی پہلو ہیں ۔جن میں ایک خُصوصی کردار اور زمانی نظم پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کائنات ایک مسلسل اور متواتر حالات و واقعاتِ جاریہ کا اِرتباط ہے۔ وقت ایک خطِ مستقیم ہے اور یہ کسی معلوم نہیں کہ یہ خط جو کھنچا چلا جا رہا ہے کہاں پر ختم ہوگا۔ ایک بچہ جنم لیتا ہے، جوان ہو جاتا ہے اور پھر شباب کے ایّام سے گذر کے بڑھاپے میں قدم رکھتا ہے اور پھر فنا کی وادی میں چلا جاتا ہے۔ ایک عربی شاعر نے اس زمانی عمل کو گردشِ ایام کے ساتھ یوں جوڑ دیا ہے۔

اَشَابَ الصَّغِیرُ وَ اَفْنَی الْکَبِیرُ
کَرُّ الْغَدَاۃِ وَ مَرُّ الْعَشِیّ

ترجمہ:۔ چھوٹا جوان ہو گیا اور بوڑھا فنا ہو گیا صبح اور شام کے آنے اور جانے سے۔

فی الحقیقت صبح و شام کی گردش، وقت کی رفتار، موسموں کا الٹ پھیر اور ماہ و سال کا یہ نظام ہی اس عظیم طاقت کے نشانات اور علامات ہیں، جس کے حقیقتِ مُطلقہ ہونے پر ایمان لانا اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ وقت خدا نہیں ہے لیکن غیر مسلم دانشوروں کا ایک گروہ وقت کو حقیقت ازلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جرمنی کے مشہور عینیت پسند (Idealist) فلسفی کانٹ زمان و مکان کو ایک داخلی حقیقت تصور کرتا ہے۔ کانٹ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اشیاء کی ماہیت کو صرف اس کے ظاہری رنگ و بو سے پہنچانا جا سکتا ہے۔ یعنی مظاہرِ قدرت سے۔ حدیث میں ایک جگہ یہ بھی آیا ہے کہ ''زمانے کو بُرا مت کہو کیونکہ زمانہ خدا ہے۔ زندگی اور وقت کا آپس میں گہرا رشتہ ناتہ ہے اور یہ وقت ہی ہے جو انسانی زندگی کو رنگوں، پھلوں پھولوں، فصلوں اور بہار و خزاں کی خوبیوں سے پیوستہ کرتا ہے۔ دہر یا زمانہ خدا ہے، یہ ایک بحث طلب بات ہے، چنانچہ دنیا میں ہزاروں دہری پیدا ہوئے ہیں جن کا نظریہ یہ رہا ہے کہ زمانہ قدیم ہے، ازل ہے،

کائنات کی ابتدا اور واقعات کا خالق ہے۔ اسلام کا نظریہ بھی یہی ہے لیکن وہ دہریا زمانے کو مخلوق قرار دیتا ہے نہ کہ خالق۔ وقت کا اپنا کوئی اختیار اور اثر نہیں، بلکہ اس پر فعل، فاعلِ حقیقی کی وجہ سے ہے۔ دہریت کے نظریے سے متاثر لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ کاروبارِ ہستی کے ہنگامے از خود قائم ہیں اور اس کے پیچھے کوئی طاقت نہیں، لیکن مذاہبِ عالم کا مشترکہ نظریۂ کائنات، اس کے النفس و آفاق کے بارے میں یہ رہا ہے کہ ایک ماورائی طاقت ہے جو کائنات کی حرکت و حرارت کو ایک توازن میں رکھے ہوئی ہے اور کہیں بھی نظامِ کائنات میں تفاوت یا عدم توازن دکھائی نہیں دیتا ہے۔ گردشِ ایّام سے وابستہ حقیقتوں کی تہہ تک پہنچنے کی فلسفیانہ کوششوں میں ہزاروں ذہین ترین انسانوں نے اپنی زندگیوں کے بہترین اوقات گنوا دیئے اور انہیں مایوسی و محرومی کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں لگا۔ کائنات کی حقیقت و ماہیت کی افادیت سے بوعلی سینا اور جلال الدین رومیؒ دونوں آگاہی حاصل کرتے رہے لیکن دانشور اقبال کی نظر میں بوعلی سینا اونٹنی کے پاوں سے اٹھے ہوئے گرد و غبار میں گم ہو گیا جبکہ رومی نے اونٹنی کے جسم کا محمل پالیا۔ یعنی فلسفی اور حکیم حقیقت سے محروم ہی رہا اور ایمان و معرفت کی دنیا کا مسافر رومیؔ منزل تک جا پہنچا۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم

دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

گردشِ ایام سے وابستہ تمام تخلیقات کو اسلام اس اعلیٰ و ارفع ذات کے ساتھ وابستہ کرتا ہے، جو سورۂ بقرہ کے الفاظ میں ''ہمیشہ زندہ رہنے والا اور دائم و قائم ہے۔ اُسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ وہ کائناتِ ارض و سما کا مالک ہے''۔ اس کائنات کی کسی بھی شے پر ہم نظر ڈالتے ہیں، تو ایک نظام کے اندر پابند نظر آتی ہے۔ پانی ہر جگہ نشیب کی طرف جا رہا ہے اور آگ بلندیوں کی

طرف لپک رہی ہے۔ ہر صبح کے بعد شام آتی ہے اور ہر شام کے بعد صبح۔ کائنات کے اس منصوبہ بند نظام سے ظاہر ہے کہ اس پر ایک ہمہ گیر قانون کی گرفت ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ انسان نے اپنی تاریخ کے ہر عہد میں کائنات کے خالق و مالک کے بارے میں اپنے ذہن کی قوتوں کو بروئے کار لایا اور اپنی فکری اِدراکی اور حسیاتی صلاحیتوں سے تخلیقاتِ عالم کی عمر ماہئیت مِقدار اور مزاج کا تعیُّن کیا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ساری کوششیں قیاس کے مقامات پر منتج ہوگئیں۔ ہم اس دنیا میں جن ایام اور ماہ وسال سے گذر رہے ہیں' قرآن پاک میں اس کی دوسری صورت بیان کی گئی ہے ''اللہ کے ہاں ایک دن تمہارے پچاس ہزار سال کے برابر ہے''۔ اسی طرح کئی موقعوں پر دنوں کی ماہئیت الگ الگ انداز میں بیان کی گئی ہے۔ مرورِ ایام کا یہ سلسلہ کرۂ ارض پر کروڑوں سال سے جاری ہے اور کسی کو یہ معلوم نہیں کہ یہ سلسلہ کہاں پر ختم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تمام اشیأ' ذراتِ تخلیقات خواہ وہ دور ہوں یا نزدیک ایک دوسرے سے مخفی انداز میں ایسے مربوط کر رکھی ہیں کہ بقول ایک برطانوی شاعر ''اگر آپ ایک پھول کو چھیڑیں تو آسمان پر کوئی تارا کانپ اٹھے گا''۔ وحدت کائنات کا یہ تصور گلیلیو اور نیوٹن کے زمانے سے قائم ہوا۔ یہ وحدت ستاروں کی رفتار اور مادوں کی ساخت سے ظاہر و باہر ہے۔ ایک عبرانی شاعر نے بہت خوب کہا ہے۔ ''اے اللہ جب میں تیرے آسمانوں' آفتابوں اور تاروں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ تو نے ایک حقیر سی مخلوق یعنی انسان کو اتنی اہمیت کیوں دی کہ اسے اپنا جلوہ بھی دکھایا''۔ صرف جلوہ ہی نہیں بلکہ اپنا نائب بھی زمین پر مقرر کیا۔ انسان خدا کی اس زمین پر اشرف المخلوق ہے لیکن خدا کی تمام عنایتوں اور مہربانیوں کے باوجود وہ اپنی زندگی کے اوقات ایسے گذارتا چلا جارہا ہے کہ اپنی ذات اور اپنی انا پسندی کے بغیر اسے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔

وقت کی رفتار کے ساتھ افراد اور اقوام کی زندگی کے حالات بھی بدل جاتے ہیں۔ ظلم جب حد سے گذرتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ عرب دنیا میں تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ گراں خواب مصری اور لیبائی بیدار ہونے لگے ہیں۔ آمریت ملوکیت اور شہنشائیت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو چکا ہے۔ حُسنی مبارک کا تیس سالہ دورِ اقتدار اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ کب تک طاقت کے بل بوتے پر عوامی خواہشات کو کچلا جا سکتا ہے۔ مصؔر کے اسلام پسندوں کو عبدالناصر کے زمانے سے آج تک بے شمار مظالم کا سامنا کرنا پڑا۔ عرب امارات شہزادوں کے لیے عیش گاہوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سعودی عرب کی صورت حال بھی اچھی نہیں۔ وہاں بھی ملوکیت کا ایسا نظام قائم ہے کہ کسی سعودی کو زبان کھولنے کی اجازت نہیں۔ اگر چہ سڑکوں کی تعمیر' خوشحالی نہریں ایئر پورٹ' جدید وسائل و ترقیات' غذائی اجناس کی کثرت اور تعلیم کی طرف توجہ آلِ سعود کی ترجیحات میں شامل ہے تاہم جمہوری و عوامی خواہشات کے مطابق حکومت کے قیام کے لیے کبھی بھی وہاں کوئی کوشش بار آور نہیں ہونے دی گئی۔ اسلامی دنیا کے مختلف ملکوں میں مغربی سامراج اور سوشلسٹ حکمرانوں کے خلاف اندر ہی اندر لاوا ابل رہا ہے اور ان ملکوں کے عوام فکری اور نظری اعتبار سے غلامی کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور سلاطین و امرأ کا تسلُّط ختم ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ایک بین صداقت ہے کہ آمرانہ نظام کے تحت معاشی' اقتصادی اور سائنسی اعتبار سے عرب ملکوں نے کافی ترقی کی' اور لوگ سیاست کے مکرو فریب سے آزاد ہی رہے لیکن عوام اپنے لیے کون سا نظام زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں' اس کے بارے میں سوچنے کی انہیں مہلت نہیں دی گئی۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہاں حالات بدلنے والے ہیں اور ایک نئی سوچ' سیاسی تبدیلی کی شکل میں وجود میں آ رہی ہے۔ اقبال نے نوے سال پہلے عالمی سطح پر تبدیلیوں کی بشارت دی تھی' ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی فکر ایک ہمہ گیر

تبدیلی کے ارتقائی مرحلوں سے گذر رہی ہے۔ اقبال خدا کے دربار میں مسلمانوں کے فکر و عمل میں انقلاب کے لیے دعا کرتے رہے اور اسلاف کے خلوص، ایمان، اور یقین کی دولت دوبارہ عطا ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

؎ شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پَر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰؓ سوزِ صدیقؓ دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

وقت اپنی تمام تر تیز رفتاری کے ساتھ اپنے پیچھے حالات و حادثات کے نقوش چھوڑ کر نئے ہنگاموں اور نئے واقعوں سے بغلگیر ہے۔ یقیناً وہ لوگ حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہیں، جو وقت کی قدر کرتے ہوئے حسن و خیر، صلاح و فلاح، رفاہِ عام اور رضائے رب کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔

؎ خیرے کُن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نماند

زندہ است نام فرخِ نوشیرواں بہ عدل
گرچہ بسے گذشت کی نوشیرواں نماند

ترجمہ:۔اے انسان اچھائی کا راستہ اختیار کر اور عمر کو غنیمت جان' اس سے پہلے کہ اعلان ہو جائے کہ فلاں شخص مر گیا۔نوشیروان اپنے عدل وانصاف کے سبب اب بھی زندہ ہے اگرچہ نوشیروان کو انتقال کئے ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔
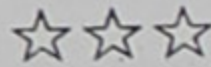
ماحولیات کا توازن اور فکرِ اقبالؒ
(عالمی ماحولیاتی دن کے تناظر میں)

عہدِ حاضر میں انسانی دنیا کو جن پریشانیوں اور پیچیدگیوں کا سامنا ہے ان میں ماحول سے متعلق گوناگوں مسائل و مصائب سرِ فہرست ہیں، جن کے سبب پورا کرۂ ارض خدشات اور خطرات میں مبتلا ہو چکا ہے۔ ایجادات، مشینی آلات اور برق و بخارات نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بے پناہ سہولت، آرام اور آسائش کے حالات یقیناً پیدا کیے، وہیں سطحِ زمین پر رہنے والی انسانی آبادی ماحولیاتی عدمِ توازن، موسمیاتی تغیّر و تبدُّل، درجہ حرارت میں زبردست اضافے، کارخانوں سے خارج ہونے والے دھویں کے اثرات اور دیگر خطرات کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کرۂ ارض بالخصوص انسانی بستیوں، شہروں اور آبادیوں میں مشینی اور صنعتی کارخانوں کا پھیلاو اگر اسی تناسب میں جاری رہا، تو وہ دن دور نہیں جب زمین پر قیامتِ صُغریٰ کے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔ گلیشر پگھل کر رہ جائیں گے اور ماہرین کے اندازے کے مطابق اکثر و بیشتر جزیرے ساحلِ سمندر کے قریب متعدد مقامات زیرِ آب آجائیں گے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج کا فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

کائنات کے بنانے والے نے ایک حکیمانہ منصوبے کے تحت تمام اشیاء کی ترتیب میں ایک توازن پیدا کیا ہے چنانچہ اشیاء کو ان کے اضداد سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ صبح وشام، سیاہ وسفید، سرد وگرم اور طلوع وغروب کا ایک ایسا منصوبہ روبہ عمل ہے، جس میں بگاڑ تفاوت، اور عدم توازن کا کہیں کوئی عمل دخل نہیں۔ قرآن کے نظریۂ توازن میں تمام اشیاء کے مابین ایک انحصار اور ایک دوسرے کے ساتھ ارتباط وانسلاک کی وضاحت کی گئی ہے اس نظریے میں جُز اور کُل کے تعلق کا ذکر ملتا ہے۔ اسلام ماحول سے وابستہ اشیا ومظاہر کو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے ساتھ جوڑ دیتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ مظاہرِ فطرت اور اشیاَ کائنات کو انسان لے لیے مُسخر کرنے کی بات کرتا ہے۔ یہ انسان قدرت کی تمام قوتوں پر قابو پا سکتا ہے اور اگر یہی انسان اس کے لیے مُسخر کی گئی چیزوں کے توازن، تنظیم اور ترتیب کے ساتھ کھیلنے کی کوشش کرتا ہے تو فطرت ایسے افراد اور اقوام کے عمل سے چشم پوشی نہیں کرتی ہے۔ جنگلات کی کٹائی، آبی ذخائر میں تعمیرات، ''دریاؤں'' کے کناروں پر ہزاروں بیت الخلاؤں کی تعمیر، آب گاہوں کے اطراف واکناف پر ناجائز قبضہ، گھروں، دفتروں، کارخانوں اور صنعتی اداروں میں مستعمل اشیاَ کو سرِ راہ پھینکنے کا طریقہ، زرعی زمین پر مکانات، پیٹرول پمپ اور کارخانے کھولنا، کہاں کی انصاف پسندی ہے۔ ماحول بگڑ نہ جائے تو اور کیا ہوگا۔ پولیوشن کنٹرول بورڈ، ماحولیاتی بیداری کی تحریک، شعبہ ماحولیات کشمیر یونیورسٹی رضا کار تنظیموں کی سرگرمیاں اس طوفان بدتمیزی،

شعور کی کمی، خود غرضی، نفسا نفسی اور ہوس رانی کی صورت حال میں کیا تبدیلیاں لا سکتی ہیں۔ جب انسان اپنی خود غرضی اور ہوس پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو وہ ماحول کی پاکیزگی اور توازن کی ہر ادا کے ساتھ کھلواڑ کر سکتا ہے۔ وہ مسجد کے لیے قیمتاً زمین خریدنے کے بجائے دریا کے کناروں کو ہڑپ کر کے اس پر ''بیت اللہ'' کی تعمیر کرنے کا عملِ صالح انجام دیتا ہے اور اپنی انا پسندی کے لیے ماحول کے حسن و جمال کو روند سکتا ہے۔

شیطان کا شیطان فرشتے کا فرشتہ
انسان کی یہ بُو العجبی یاد رہے گی

اقبال کے فکری نظام کا پورا ماحول پاکیزہ ہے۔ چنانچہ ظاہری ماحول کی صفائی، پاکیزگی، تحفظ اور اسکو مشینی استبداد سے بچانے کی وہ تاکید کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ مغرب کے رومانی شعرأ کا اثر اقبال کی ابتدائی زندگی پر بہت گہرا رہا ہے، خاص طور پر وہ وارڈس ورتھ کے افکار سے اس لیے متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ وہ بھی مشینی اور صنعتی تہذیب کے خطرات پر اپنا ردّ عمل ظاہر کر چکے تھے۔ کئی انگریزی شعرأ اور ادبا نے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنی قوم کو مشینوں کے دھویں سے پیدا شدہ خطرناک صورت حال سے باخبر کیا تھا اور اس کثافت کے نتیجے میں گرد و پیش کی دنیا اور انسانی جسم پر مُرتّب ہونے والے اثرات و نقصانات کی نشاندہی کی تھی۔ آج میکسیکو شہر کا ہر باشندہ موٹر گاڑیوں اور کارخانوں کے زہریلے دھویں سے بچنے کے لیے ماسک کا استعمال کرتا ہے۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدا ہو گا

مشینوں کی ضرورت اور کارخانوں کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں، یہ انسانوں کی ان ضرورتوں کو

پورا کرتے ہیں، جن کے لیے انسان کو زبردست پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا' لیکن کسی چیز کا حد سے گذرنا توازن اور تناسب کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اپنی ایک مشہور نظم ''زمانہ'' میں جو صرف دس شعروں پر مشتمل ہے' اقبال نے مغرب کی مادّی ترقی اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ صورتِ حال کا نقشہ بڑے دل نشین انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جُوئے خوں ہے یہ جُوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ
ہوائیں ان کی فضائیں ان کی سمندر ان کے جہاز ان کے
گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکر بھنور ہے تقدیر کا فسانہ

چند دن پہلے ایک ہندوستانی ڈاکٹر سید تقی عابدی جو کینیڈا میں پچیس برسوں سے مقیم ہیں اور علامہ اقبال کے روز وشب پر ایک کتاب بھی تحریر کر چکے ہیں' یورپ میں ماحولیات کی کثافت اور کشمیر میں خوشگوار ماحول کی بات کر رہے تھے' ان کا کہنا تھا کہ مغرب کا مشینی انسان اب صرف سکون' خاموشی' تنہائی طمانیتِ قلب اور ذہنی دباو سے نجات کا متلاشی ہے۔ ڈاکٹر عابدی کی گفتگو سن کر مجھے اقبال کی نظم ''ایک آرزو' یاد آگئی' جس میں ماحول کی پیچیدگی' دنیا کی محفلوں سے اکتاہٹ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی وجسمانی صورتِ حال کا ذکر بڑے لطیف پیرائے میں کیا گیا ہے۔ موجودہ ہیجان انگیز اور پُرشور ماحول کے ستائے ہوئے لوگوں کے لیے یہ نظم اپنے اندر حکمت وبصیرت اور قدرت کی نظافت' شفافیت' عفّت اور طمانیت کا ایک لاجواب درس رکھتی ہے۔

ے دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

بیس اشعار پر مشتمل نظم ''ایک آرزو'' جس کے چند شعر ہی اوپر پیش کئے گئے دراصل ماحول کی پاکیزگی، سادگی صفائی اور ستھرائی پر دلالت کرتی ہے۔ یہ نظم اپنی سلاست اثر آفرینی اور شعری محاسن کے اعتبار سے بانگِ درا کی بہترین نظموں میں شمار کی جاتی ہے۔ نظم میں جن جذبات اور احساسات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ ہر اس ذی حس کے قلب و جگر کی عکاسی کرتے ہیں، جو اپنے ماحول کو آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک دیکھنا چاہتے ہیں اقبال کے نزدیک جو قوم آسمانی فیضان سے محروم ہو جاتی ہے، اپنے گردوپیش کی فطری خوبیوں سے کنارہ کش ہوتی ہے اور ذمہ داریوں کے احساس سے دامن جھٹکتی ہے، تو اس قوم کے کمالات کی انتہا بجلی، بھاپ

اور دیگر آلات کی ایجاد ہوا کرتی ہے۔

؎ وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

کلام اقبال پر ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد آدمی کے سامنے ایک ایسے ماحول کی تصویر کشی ہوتی ہے، جو داخلی اور خارجی دونوں اعتبار سے پاک وصاف ہو۔ شعراء اردو عموماً بادہ وجام کی بات کرتے ہیں، موسیقی اور حسنِ نسوانی کی تعریفوں سے لذت گیر ہونے کی مساعی کرتے ہیں، لیکن اقبال پہاڑ کے دامن کی خاموشی، ندی کا کنارہ اور گُلِ لالہ کی صحبت کی خواہش ظاہر کرتا ہے۔

؎ نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب
سکوتِ کوہ و لب جُوے و لالۂ خود رُو

اصل میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان فطرت کے پاکیزہ ماحول کے قریب رہے تو وہ مظاہر فطرت سے ایسی کیفیت حاصل کر سکتا ہے، جو شراب، شاعری اور موسیقی سے حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔ عالمی یوم ماحولیات منانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اپنے گرد وپیش کو دیدہ زیب بنانے، کثافتوں کو دور کرنے دریاوں، ندی نالوں اور جھیلوں میں کوڑا کرکٹ ڈالنے سے اجتناب کرنے جنگلوں میں موجود ہرے بھرے درختوں کی کٹائی سے احتراز کرنے، صنعتی کارخانوں کو انسانی آبادیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرے ورنہ فطرت کے مظاہر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور کھلواڑ مستقبل میں پوری نسلِ انسانی کو مہنگا پڑے گا۔

☆☆☆

عروسِ کشمیر...... برف کی حنا بندی

میرا کشمیر کتنا پیارا ہے

بلند قامت پہاڑوں‘ گھنے جنگلوں اور شاداب وادیوں کی سرزمین میں کشمیر ان دنوں برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے ہ عروسِ کشمیر کی برف کے ہاتھوں حنا بندی ہو چکی ہے اور یہ دلہن فطرت کی عطا کردہ صاف و شفاّف نعمت پر نازاں ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ کشمیر کی ہریالی‘ جنگلوں کی شادابی‘ دریاؤں کی روانی اور اِس کے حُسن و جمال کی فراونی برفباری سے وابستہ ہے۔ کشمیر میں اس وقت بھی ایسے برفانی خطّے موجود اور محفوظ ہیں جن میں صدیوں پہلے گری ہوئی برف کی چادریں زمستانی ہواؤں کے سبب جمی ہوئی ہیں۔ کشمیر کا فطری وجود‘ اس کے جھرنوں کی چھما چھم‘ اس کے گھنگھور گھٹاوں کا رم جھم اور اسکی خنک ہواؤں کی تازہ کاری برفباری سے جی ہوئی ہے۔ کشمیر کے ہزاروں گاؤں دیہات کو سرما اور گرما میں پانی کی دولت سے سیراب کرنے والا دریائے جہلم اسی برف کا مرہونِ منّت ہے۔ مارچ سے اگست تک اس دریا کی موجیں برفاب کی بدولت نہنگوں کے نشیمن تہہ و بالا کرتی ہیں۔ آج پانی کی قلت کے باعث جہلم سکڑ سکڑ کر کئی مقامات پر ایک زمانے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ کاش کوئی دور اندیش حکمران کشمیر میں جنم لیتا جو جہلم کی تاریخ اور اس سے وابستہ تہذیب کو بچا لیتا۔

گذشتہ تیس برسوں سے مجھے اپنے وطنِ عزیز کشمیر کے تمام سیاّحی مقامات‘ فطرت کے

حسین مناظر واَماکن کو نزدیک سے دیکھنے اور ان سے ایک کیف وسمستی حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ لداخ کے ننگے بے آب وگیاہ پہاڑوں کے اوپر زمینی اور ہوائی سفر میں لطف اندوز ہونے اور فطرت کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ میں نے آج سے چھبیس سال پہلے روزنامہ ''آفتاب'' میں اپنا سفر نامہ لداخ تین قسطوں میں تحریر کیا تھا۔ آج بھی ہر مہینے فرصت کے اوقات میں پیارے کشمیر کے گنڈ' کنگن' نسبل' ڈُلر' بانڈی پورہ' لولاب' گلمرگ' نیل ناگ' کپرن' اہرہ بل' نور آباد' کوکرناگ' ڈکسم پہلگام' چندن واری' آرڈ' اور دیگر قدرتی حُسن سے مالامال علاقوں میں جانے اور اَبرو برف سے تخیلاتی انداز میں بات کرنے کے مواقع آجاتے ہیں۔ سونہ مرگ جاتے ہوئے ایک پہاڑ کی بلندی سے برفیلا پانی سرکتا' مچلتا اور بلکھاتا ہوا نالہ سندھ کے پتھروں سے ٹکراتا ہے۔ آج وہ پہاڑ برف کے تودوں میں لپٹتا ہوگا۔ ان فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں سے بادل ہم کلام ہوتے ہیں۔ میں ہر بار وہ منظر دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو چند لمحات کے لیے انہی بادلوں اور بلندیوں میں گم صم پاتا ہوں ۔کشمیر کے اس حسنِ بے پایاں کو مشہور اردو شاعر غلام ربانی تاباںؔ نے یوں قلمبند کیا ہے۔

برف کا ٹیکا دمکتا تھا جبینِ کوہ پر
بادلوں کے دوش پر گیسو تھے لہرائے ہوئے
حسن کی آرائشوں میں مو ہو جیسے کوئی
عشق کی تسخیر کے جذبوں کی شے پائے ہوئے

....

جھیل کو ٹھنڈی ہوائیں گدگداتی چھیڑتی
تیز جھونکا جب کوئی آجائے پانی مسکرائے

شورشِ ہر موج میں غلطاں ہزاروں زمزمے
جیسے مانجھی رات کو جہلم کنارے گیت گائے

کشمیر کے کھیتوں، خیابانوں، اور گلستانوں کی زندگی برف سے پگھلنے والے پانی سے قائم ہے، لیکن یہ برف بالائی علاقوں میں رہنے والے دیہاتوں، گوجروں اور لاکھوں غریبوں کے لیے چار پانچ ماہ تک گھریلو پریشانیون، موسمی بیماریوں اور بیکاریوں کا پیغام بھی لے آتا ہے۔ گذشتہ سال ہلکی برفباری کے بعد میں علاقۂ نور آباد دمحال ہانجی پورہ کے اندرونی دیہاتوں سے گذر رہا تھا۔ میں نے کیا دیکھا کہ لکڑی کے بنے چبوتروں پر پانچ دس آدمی حقہ پی رہے تھے۔ زمستان میں دیہاتی زندگی کے مناظر دیکھنے کے چند گھنٹے بعد اسے راستے سے میں واپس لوٹا تو میں نے دیکھا کہ چبوترے پر بیٹھے یہ لوگ بیکاری کے سبب ابھی گپ شپ اور تمباکونوشی میں مصروف تھے۔ میں نے گاڑی سائڈ میں کھڑی کر دی۔ ان لوگوں کو سلام اور دعائیہ کلمات کے بعد پوچھا کہ جب میں سویرے یہاں سے گذرا تو آپ حقہ لیے یہاں بیٹھے تھے، اور واپسی پر آپ کو پھر یہاں دیکھ رہا ہوں۔ ان لوگوں کا جواب کیا تھا کہ ہم دسمبر سے مارچ تک چار مہینے اسی حالت میں گذارتے ہیں، صبح اور شام مسجدوں کے گرم حماموں میں ٹھہرتے ہیں۔ یہ سن کے مجھے بڑی ذہنی کوفت ہوئی کہ ابھی تک نہ عوامی سطح اور نہ سرکاری سطح پر دیہاتوں میں طویل سرما میں کام کرنے کے ذرائع اور وسائل پیدا کرنی کی کوئی نتیجہ خیز کوشش نہیں ہوئی ہے۔ میں نے ان دیہاتوں میں اپنے مکان کے ساتھ جڑے ورنڈے پر چٹائیاں بچھائے مرد و زن کو بیکار و بیمار پا کر ۱۹۲۱ میں اقبالؔ نے دورۂ کشمیر کا جو نقشہ نہایت پُر درد انداز میں کھینچا ہے۔ نظروں کے سامنے آ گیا۔

ے آہ وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
کہہ رہا ہے داستا بے دردیِ ایّام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

دیہاتوں اور دور افتادہ علاقوں کی نمائندگی کرنے والے ممبرانِ اسمبلی اور وزراٗ کو چاہئیے کہ بادوباراں اور برفباری سے چار پانچ تک بے کاری اور بے روزگاری کا تدارک کرنے اور دیہاتوں میں کام کے دن اور ورک کلچر کو متعارف کرایا جائے۔ تاکہ لاکھوں محنت کش لوگ کئی مہینون تک بیکاری سے نڈھال ہو کر نہ رہ جائیں۔

بات برف پوش پہاڑوں' حسنِ فطرت کی وادیوں اور گھنے جنگلوں کی ہو رہی تھی کہ برسبیلِ تذکرہ دیہاتی زندگی کا منظر سامنے آ گیا۔ کشمیر میں برف کا ذکر اور یہ پیکر درجنوں اردو اور کشمیری شعرا نے مختلف زاویوں میں پیش کیا ہے۔ مرحوم حکیم منظور نے اپنا ایک شعری مجموعہ ہی ''برف رُتوں کی آگ'' سے شائع کیا ہے' جس میں برف' بادل' ہوا' موسم' ڈل' ولر' اہر ہبل اور دیگر لفظوں استعاروں اور پیکروں کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ امرتسر کے ایک شاعر نے گیارہ بندوں پر مشتمل اپنی نظم میں خطۂ کشمیر کو جس فکری وفنی خوبصرتی کے ساتھ ابھارا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ میری معلومات کے مطابق مختلف زبانوں کے ایک ہزار شاعروں نے اپنے فن پاروں میں ارضِ کشمیر کی برف پوش وادیوں' اور اسکی زندگی بخش ہواؤں کو بڑے ہی پیار کے ساتھ یاد کیا ہے

ے کُہسار پہ ہے برف تودوں کا حسین تاج
چوٹی ترے کہسار کی فطرت کی ہے معراج

تومشرق و مغرب کا ہے سجودِ نظر آج
کر سکتا نہیں کوئی ترے نقش کو تاراج

ہے شرق سے غرب تک حسن کی تشہیر
اے جنّتِ کشمیر

مٹی تری آب وگُل ریحان سے بنی ہے
جانِ چمنستاں تری گل پیرہنی ہے
فطرت کے خزانون سے تری خاک دھنی ہے
آسودہ تری خاک میں تیرا وہ غنؔی ہے

ہے جسکی نوا سوزِ غم عشق کی تفسیر
اے جنّتِ کشمیر

پوشیدہ نہیں ہیں تری تاریخ کے احوال
شاہد تری رفعت کے ماضی کے مہہ وسال
کیا کم ہے ترے فخر کو یہ عظمت و اِجلال
دنیا میں مُسلّم ہے تری خاک کا اقبال

اٹھے ہیں تری خاک سے دنیا کے مشاہیر
اے جنتِ کشمیر

کشمیر میں برفباری کی بدولت حسنِ فطرت میں جو تازگی اور توانائی آجاتی ہے اور بہار و گرما کے مہینوں میں آبی وسائل اور ذخائر میں جو پھیلاو آجاتا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ برفباری اپنے ساتھ جو بے شمار مصیبتیں لے آتی ہیں ۔ ان کلاسدّ باب کشمیر میں ترہسٹھ برف

ہٹانے والی مشینوں سے نہیں ہوسکتا ہے' بلکہ اس کے لیے حکومتی اور عوامی سطح پر قبل از وقت ایک منصوبہ بندی ہونی چاہیئے ۔ چند سال پہلے والٹنگو قاضی گنڈ کا ایک پورا گاؤں برف کے نتیجے دب گیا' ایسی ہی صورت حال کسی دوسرے موقع پر بھی رونما ہوسکتی ہے۔ حکومت کے ذمہ داروں کو چاہیئے کہ برف باری کے باعث کشمیر میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے یا آنے والے دنوں میں پیدا ہوسکتی ہے' اس کے لیے قبل از وقت تیاری ہونی چاہیئے ۔ ۳۰ دسمبر ۲۰۱۰ء کی برفباری نے کشمیر میں طویل خشک سالی کے بعد مسرت اور راحت کا پیغام لایا اور ابھی مزید برفباری کی اشد ضرورت ہے تاکہ لاکھوں عوام کو گرما کے ایام میں پینے کے پانی اور زرعی زمین میں نا آب پاشی کے لیے پریشانی نہ ہو۔ قدرت اپنا عمل جاری رکھے ہوئے ہے' لیکن یہ انسان ہی ہے جو اپنی خود غرضی' دنیا پرستی اور ہوس رانی کے لیے برف سے ڈھکے جنگلوں کا صفایا کر رہا ہے' ندی نالوں اور دریاؤں کے کناروں پر مکانات اور تجاوزات کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اپنے گھروں میں استعمال شدہ بے کار اشیا اور کوڑا کرکٹ جہلم کے کناروں کی زینت بنا رہا ہے مسجدوں کے غسل خانوں سے خارج ہونے والا پانی دریاؤں کی طرف پھیر رہا ہے' کھنہ بل سے کھادن یار تک لاتعداد بیت الخلاؤں کو جہلم کے دونوں کناروں پر تعمیر کا بہت بڑا گناہ انجام دے رہا ہے۔ درجنوں ہوٹلوں اور سینکڑوں ہوس بوٹوں کا بول و براز شہرہ آفاق ڈل جھیل میں ڈال رہا ہے کاش ہم اپنی اس حسین برف کی چادر میں لپٹی عروسِ کشمیر کی عزت و عفت کی حفاظت کرتے اور اسکو انفرادی و اجتماعی سطح پر ہر قسم کی آلودگیوں سے صاف و پاک رکھتے اور اچھے شہری ہونے کا ثبوت فراہم کرتے۔

کیوں نہ کشمیر ترے نام کے صدقے جاؤں
تیری ہر صبح ہر اک شام کے صدقے جاؤں

تیرے برفیلے در و بام کے صدقے جاؤں

"ویری ناگ" اور "پہلگام" کے صدقے جاؤں

شورؔیدہ کاشمیری

کشمیر کا درویش صفت سخنور (وفات ۱۸ اپریل ۱۹۹۱ء)

بیس سال پہلے اُستادِ مکرّم غلام محمد ملک شورؔیدہ کاشمیری دارُ الفنا سے دارُ البقا کی طرف رحلت کر گئے تھے۔ مردم خیز علاقۂ شوپیان سے ابتدائی اور ثانوی تعلیم پانے کے بعد ۱۹۴۴ء میں سرینگر کے ایس۔ پی کالج سے ریاضی کے مضمون کے ساتھ گریجویشن کی۔ علی گڈھ سے ایم۔ اے اردو کے بعد شعر و ادب شورؔیدہ صاحب کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا جو ایک حقیقی استاد کی شناخت ہے۔ اردو کلاسیکی ادب پر شاید ریاست میں ان سے بہتر کوئی دوسرا صاحبِ نظر نہیں تھا۔ میرؔ و آتشؔ کے رنگ اور قنوطی عناصر و اجزا سے بھرپور شوریدہ کی شاعری اپنے اندر تہذیب کی پختگی، فن کی گہرائی اور عروض کی گیرائی سے مزیّن اور مالا مال ہے۔ غمِ ذات اور غمِ دوران کے جملہ عناصر سے مملو شورؔیدہ صاحب کی شاعری میرؔ و جگرؔ کے تغزل کی نمائندگی کرتی ہے۔

بٹ گیا اشعار میں شورؔیدہ غم
شاعری غم خوار ہو کر رہ گئی

شاعری کی تعریف و تحسین، اس کے اَہداف و مقاصد، اس کے مُضمرات و اثرات اور وارداتِ قلبی کے ساتھ اس کے گہرے تعلقات کا اظہار اکثر شعرائے اردو نے اپنے کلام و پیام میں کیا ہے۔ شاعر کیسا ہو؟ شاعری کیسی ہونی چاہیے؟ اس پر نقادوں اور شعر کے مدّاحوں کے درمیان خوب بحثیں ہوئی ہیں۔ کچھ تو اسے جذبات کو لفظوں کے پیرایے میں بیان کرنے کا نام

دے چکے ہیں۔ کئی شعرا کے نزدیک یہ حسنِ نسوانی اور محبوبِ مجازی کے سَراپا کا تذکرہ ہے۔ لیکن ایک طبقے کے نزدیک شاعری ''آدم گری'' کا دوسرا نام ہے۔ یہ تہذیب کی قدروں، شعور کے بحرِ معانی سے اٹھنے والی لہروں، جذبے اور وجدان کی کیفیتوں کو یکجا کرنے، اور پھر ان جذبات وتصورات کو پابند اور موزون اسالیب میں ڈھالنے کا خوبصورت اہتمام ہے۔ شوؔریدہ کاشمیری اپنے نظریۂ شعر کا اظہار اپنے ایک مجموعہ کلام ''جذبِ دروں'' میں برملا طور پر یوں کر چکے ہیں۔

ے ما ورائے عشق بھی ہے شاعری
زندگی کی زندگی ہے شاعری
دیدنی کیا ہے کتابِ کائنات
حضرتِ حق نے بھی کی ہے شاعری
دل نشیں ہر ہر ادا فطرت کی ہے
شاخِ گُل کی تھر تھری ہے شاعری
لفظ و معنی کو کرے تحلیل جو
روح کی وہ نغمگی ہے شاعری
شاعری کا ہے جو کوئی مُدّعا
شاعرو! آدم گری ہے شاعری
شاعری نے دل لبھایا ہے مرا
مجھ پہ بھی مفتوں ہوئی ہے شاعری

شوؔریدہ صاحب اپنے محسوسات کے لیے خوبصورت شعری علامتوں کا سہارا لیتے ہیں۔ شعری

پیکروں کا استعمال اور مقصد احساسات اور اِرتعاشات کے لیے ایک معمول فراہم کرنا ہے جس کے ذریعے وہ دوسروں تک پہنچائے جاسکیں۔ ان محسوسات کو نثر میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ شاعری میں تفصیل نہیں' اشارے اور کنایے زیادہ موثر اور معتبر ہوتے ہیں ۔شعری علامتوں اور پیکروں کا کسی نظم کی بنیاد پر جمع ہونا' ان کا ایک دوسرے پر عمل کرنا' اور ایک دوسرے سے متصادم ہونا' اس حرکی عنصر سے جڑا ہوتا ہے بلکہ اسے جنم دیتا ہے' جو شعری بیان میں اکثر پایا جاتا ہے۔ ہمارے دو بڑے شاعروں غالبؔ اور اقبالؔ کے یہاں بالترتیب بصری اور حرکی پیکروں کی فروانی ملتی ہے اور اس سے دونوں کے مزاجِ شعری پر انفرادی حیثیت سے روشنی پڑتی ہے۔ شوریدؔہ بصری اور حرکی پیکروں' بحور و اوزان کی سخت پابندیوں اور کلاسیکی شاعری کی جملہ خوبیوں کی بنیاد پر اپنے فن کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

زیست ہے بار بار گردش میں
یا کوئی رُودبار گردش
ہیں خزاں و بہارگردش میں
جیسے لیل ونہار گردش میں
ایک دل ہے ہزار گردش میں
اور بے اختیار گردش میں
ناچ آخر نچائے گی دنیا
ہے زمین و مدار گردش میں

شوریدؔہ کاشمیری کے دونوں مجموعۂ کلام ''جوشِ جنوں'' اور جذبِ دروں'' میں کشمیر کی تصویر کے مختلف رنگ اور روپ ابھرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں جاڑے کی شدت کا ذکر ہے' کہیں

کشمیریوں کے افلاس کا تذکرہ ہے اور اکثر مقامات پر سیاسی بے اصولی، جمہوری طرزِ زندگی میں موجود نقائص، شخصی راج کے مظالم اور کشمیریوں کی اجتماعی طبیعت پر برہمی کا اظہار ملتا ہے۔

گلستانِ کاشمر ہے ایک مدفن کی طرح
بے زبان لاکھوں زباں والے ہیں سوسن کی طرح

....

آج بے روح خیرِ اُمّت ہے
بے اثر کیوں ہے نعرۂ تکبیر
دیکھ کے اپنے گلستان کا حال
نالہ زن یوں ہے بلبلِ دیگر
خوشنوا ہوں چمن کے کب آزاد
اور آباد گلشنِ کشمیر

مایوسی اور افسردگی، یاس اور قنوطیت کے اسلوب میں ڈھلی ہوئی شوریدہ کی بیشتر شاعری کبھی کبھار امید، روشنی، بہتر مستقبل اور خوشگوار تبدیلی کی غمازی بھی کرتی ہے۔ وہ اقبال کے الفاظ میں اپنی ''کِشت ویران'' سے مایوس نہیں بلکہ ''ذرا نم'' ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔

دعاؤں کا شاید جواب آرہا ہے
عجب غیب سے انقلاب آرہا ہے
نہ جانے انہیں کیوں حجاب آرہا ہے
مرے شیب پر کیا شباب آرہا ہے

نئی جاہلیت کی چھٹ جائے ظلمت
جہاں میں عجب آفتاب آ رہا ہے
چہکنے لگے گل تو بلبل مہکنے
کوئی نو دمیدہ گلاب آرہا ہے
خدا جانے شوریدہ کیا کہہ رہا ہے
خیال آرہا ہے نہ خواب آرہا ہے

داخلیت اور گردوپیش کی صورتِ حال کا نقشہ شوریدہ قافیوں میں جدّت' اور ندرتِ بیان کے عجیب و نادر نمونوں کے ساتھ کرتے نظر آتے ہیں۔ قوافی میں رنگینی کا اہتمام کرتے ہوئے مجھے عبدالعزیز خالدؔ کے ردیف و قافیہ کی رنگ آمیزی کے نقوش یاد آتے ہیں۔ قوافی میں جدّت کی ایک نادر مثال شوریدہ صاحب کے ہاں ملاخطہ کیجئے۔

دل ہوا تھا مرا فنا فی الشعر
خود نما جیسے تھا خدا فی الشعر
دردِ دل کی تھی کیا دوا فی الشعر
ڈھونڈلی قوتِ شفا فی الشعر
میرؔ سے تابہ میرزاؔ دیکھی
دلبروں کی ادا ادا فی الشعر
مردِ حق' صاحبِ خودی اقبالؔ
یاد دیتا رہا خدا فی الشعر
اور ہی رنگ میں تھا وہ رنگا

رنگ اس کا تھا بس جدا فی الشعر
عاقبت ہو بخیر عاشق کی
ہے یہ شورؔیدہ کی دعا فی الشعر

شورؔیدہ کاشمیری کے ساتھ میرا پہلا تعارف ۱۹۷۲ء میں اس وقت ہوا جب میں نے ڈگری کالج اسلام آباد میں بی۔اے فرسٹ ائیر میں داخلہ لیا تھا۔کالج میں ریاست کے بہترین اساتذہ درس وتدریس کے ساتھ وابستہ تھے۔ان بلند وقار اور نابغۂ روزگار استادوں کی تنخواہیں قلیل تھیں، لیکن تعلیم وتدریس ان کا مشن تھا اور پروفیسری کا منصب ان کے لیے وزارتِ عظمٰی سے کم تر نہیں تھا۔ان ایام میں پلوامہ، شوپیاں، کولگام اور اسلام آباد اضلاع کے لیے ایک ہی ڈگری کالج ہوا کرتا تھا اور واقعی وہ علم وہنر کا گہوارہ تھا۔شورؔیدہ کاشمیری، ستار احمد شاہد، این۔ڈی درانی اردو پڑھایا کرتے تھے، لئیق احمد قریشی، روپ کشن ایما، اور پروفیسر وکیل انگریزی کی تدریس سے وابستہ تھے اور عربی وفارسی کی چلتی پھرتی ڈکشنری مولوی محمد ابراہیم عربی زبان کے مدرّس تھے۔ایک سے ایک بلند پایہ اساتذہ کی کہکشاں میں جیسا کہ میں اور میرے ہم جماعتی محسوس کر رہے تھے کہ شوریدہ کشمیری کالج کے جس راستے سے گذرتے تھے اساتذہ، طلبہ اور انتظامی عملہ انکی بڑی عزت کرتے تھے۔ بتدریج میں شوریدہ صاحب کی قربت میں آ گیا اور انہوں نے کالج میگزین ''ویری ناگ'' کے گوشۂ اردو کی ادارت میرے سُپرد کی، چنانچہ شاگرد اور استاد کا رشتہ برابر ۸ اپریل ۱۹۹۱ء تک روزانہ کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں مربوط رہا اور وفات کے بعد راقم الحروف کو ان کی رہائش گاہ پر ''یوم شوریدہ'' منانے، اردو شعرو ادب اور اقبالیات کے تئیں ان کی خدمات کو سراہنے اور ان کی سادہ زندگی سے سبق حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور بعد میں ان کے آبائی علاقہ سرزمین شوپیان کے ڈگری

کالج میں ۱۹۹۲ء میں ''بیادِ شوریدہ کاشمیری'' کے زیرِ عنوان ایک کتاب اجرا کرنے کا موقع فراہم ہوا، یہ کتاب اقبال اکیڈمی کشمیر کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی۔ ایک سو بائیس صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی کتاب ایک مردِ قلندر، ایک بے نظیر سخنور اور ایک صالح استاد کی سادہ و پُرکار زندگی کا مرقع ہے۔ اس کتاب کے آخری صفحہ پر جناب ناظر کولگامی کی نظم ''شوریدہ...... بلبلِ کشمیر اردو نغمہ خواں'' کے یہ اشعار شوریدہ صاحب کی شخصیت کا ایک اجمالی احاطہ کرتے ہیں۔

آہ وہ جو تھا ہمارا کیا نہ تھا؟
کیا لکھوں رنگ اس کے وہ کیسا نہ تھا؟
بلبلِ کشمیر اردو نغمہ خوان
چہچہاتا تھا کبھی تھکتا نہ تھا
وہ شریف النفس، خوش خُو خوش خیال
عُجب کا، پندار کا مارا نہ تھا
شاعرِ رنگین نوا، طاعت گذار
دردِ دل اُس سے کبھی چھوٹا نہ تھا
بس کتابوں میں قلم کے واسطے
اور کسی سے جیسے کچھ رشتہ نہ تھا

راقم الحروف نے کالج میں داخلہ پانے کے بعد ریاست کے بہت سارے اصحابِ علم و ادب، ناقدینِ فن اور علماءِ دین کو بہت قریب سے دیکھا اور سُنا ہے اور اُن کی صحبتوں اور علمی مذاکروں سے مستفیض ہونے کی سعادت حاصل کر چکا ہے، لیکن شوریدہ صاحب کا معاملہ سب سے جداگانہ مگر قلندرانہ تھا۔ ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۱ء تک غالباً ہر اتوار کو صبح سویرے میں نئی

بستی اسلام آباد میں اُن کی رہائش گاہ پر حاضر ہوتا تھا۔ اِنہوں نے پنچورہ شوپیوں کے بجائے اسلام آباد کے مرکزی مقام کو پسند فرمایا تھا اور ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں، جریدوں اور شعرائے اردو کے مجموعہ ہائے کلام میں اس قدر مستغرق ہوتے تھے کہ انہیں کھانے پینے، گھر کے لوازمات اور ضروریات کی فکر کبھی دامنگیر نہیں ہوتی تھی۔ انہیں سگریٹ نوشی میں ایک عجیب مزہ محسوس ہوتا تھا۔ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے تھے اور سگریٹ کے ختم ہونے کا اندازہ اُس وقت ہوتا تھا کہ جب ان کی انگلیوں میں گرمی سرایت کرتی تھی۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ شعر کہتے وقت وہ مغموم، متفکر اور چہرے پر بیک وقت مسرت اور ملال کے آثار نمودار رہتے تھے۔

بیزار کر دیا ہے، بیمار کر دیا ہے
اس شاعری نے مجھکو بیکار کر دیا ہے
بس روز و شب گھمائے مرکز کے گرد اپنے
شاعر کو شاعری نے پرکار کر دیا ہے
ناراض اَقربا ہیں، اہل و عیال ناخوش
احباب کو بھی اُس نے اَغیار کر دیا ہے
بے خوابیوں سے شب کی، بے تابیوں سے دن کی
جو خُفتہ دل تھے، انکو بیدار کر دیا ہے
میں شاعری کو چھوڑوں، چھوڑے اگر یہ مجھکو
شوریدہ کیا پلا کر، سَرشار کر دیا ہے

ایک بار میں نے ''نکاتُ الشعرا'' کتاب عاریتاً ان سے لی۔ شام کو دورِ ان مطالعہ کتاب کے

آخری صفحات میں میں نے پانچ سو روپے دیکھے۔ اگلی اتوار کو حسب معمول میں ان کی قیام گاہ پر پہنچا اور کتاب واپس کرنے سے پہلے اُن سے عرض کیا کہ ''آپ کی کتاب بڑی زردار ثابت ہوئی''۔ مسکرائے اور میں نے پانچ سو روپے اُن کے سامنے والے چھوٹے ٹیبل پر رکھے۔ اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگے ''ہاں دو سال پہلے مجھے پانچ سو روپے کے گم ہونے کی پریشانی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ نکاتُ الشعرا کا مؤلف چُرا کر لے گیا ہے''۔ فرطِ خوشی سے دفعتہً اٹھے اور ایک الماری کا قفل کھول دیا اور شوپیاں کے سیبِ عنبریں کو کاٹ کر اسکی چند قاشیں مجھے کھلائیں۔ اس سیب کی تعریف میں انہوں نے ایک عمدہ چھوٹی بحر پر مشتمل نظم بھی تحریر کی ہے

اے سیب عجب تو خوشنما ہے
رنگین و حسین و دل کشا ہے
دیکھا ہے بخواب جس نے تجھ کو
فرزند اسے عطا ہوا ہے
کہتے ہیں کہ آم کے تھے عاشق غالب
شوریدہ کو فقط ذوق ترا ہے

۹ نومبر ۱۹۸۶ء کو راقم الحروف نے جب اقبال اکیڈمی کشمیر کا سنگِ بنیاد رکھا تو بزرگوں، ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد میری حوصلہ افزائی کے لئے کمر بستہ ہوئی، ان میں مرزا عارف بیگ، خواجہ محمد امین بچھ، مظہر امام، میر غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، غلام محمد واعظ، پروفیسر ضیاٗ الدین، پروفیسر حامدی کشمیری اور شوریدہ کاشمیری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شوریدہ صاحب اقبال اکیڈمی کشمیر کے پروگراموں کے ساتھ اس قدر منسلک ہو گئے تھے کہ سرینگر، بارہمولہ یا سوپور میں کسی تقریب کے انعقاد کے موقعہ پر وہ ایک دن پہلے سرینگر تشریف لاتے

اوران کا قیام بٹہ مالو کے قریشی صاحب' یاناو پورہ کے ضیاء الدین صاحب مرحوم کے ہاں ہوا کرتا تھا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ پروفیسر ضیاء الدین کہا کرتے تھے کہ "میں آج دنیا کا خوش نصیب آدمی ہوں کہ ایک درویش' ایک شاعر' ایک مستند استاد میرے گھر میں قدم رنجہ ہوئے ہیں"۔ راقم کو شورؔیدہ صاحب کی ذات میں پوشیدہ فقر و غنا نے بے حد متاثر کیا تھا۔ دو تین بار میرے ساتھ پہلگام کی فرحت گاہ دیکھنے اور حسنِ فطرت کا نظارہ کرنے چلے تھے اور میرے ساتھ نالۂ لدر کے کنارے فطرت پسندی کے حوالے سے کہے گئے اردو شاعروں کے کلام پر بیت بازی کرتے رہے۔ گرمی کے ایام میں میرے آبائی قصبہ بجبہاڑہ تشریف لائے' یہاں حضرت بابا نصیب الدینؒ کا عرس منایا جا رہا تھا اور روایتی دنبالی کا غلغلہ ہر طرف برپا تھا۔ شوریدہ صاحب نے "دنبالی" کا منظر دیکھ کر فی البدیہہ کئی شعر کہہ دیئے

آو اے عاشقو دنبال کریں

فکرِ دنیا کو پائمال کریں

فروری ۸۶ء میں ہم دونوں استاد اور شاگرد دہلی میں اپنی کتابوں کی طباعت کے لیے کئی دن رکے۔ یو۔ پی کے کئی شہر دیکھنے اور دار العلوم دیوبند کے مہمان خانے میں ٹھہرنے' وہاں علماً کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے اور کئی کتابیں خریدنے کا موقعہ ملا۔ قیام دیوبند کے دوران شوریدہ صاحب نے رائے بریلی لکھنو جانے کی خواہش ظاہر کی تاکہ حضرت علی میاںؒ سے شرف ملاقات حاصل ہو جائے۔ شوریدہ صاحب لکھنو تشریف لے گئے اور میں دہلی واپس لوٹا۔ شورؔیدہ کاشمیری مزاجاً لاابالی قسم کے انسان تھے۔ انہیں زندگی میں کئی تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا' لیکن جملہ تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ ایک قطعۂ زمین پر عدالتی طوالت سے پیدا شدہ ذہنی دباو کا اکثر تذکرہ کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں "مردم گزیدہ بھی اور عدالت

گزیدہ بھی ہوں"

کوچۂ یار میں عدالت ہے
دیکھیے کیسی اب سماعت ہے
جو عدالت زدہ ہو برسوں سے
زندگی اسکی ایک مصیبت ہے
پیشیاں بے حساب و طولانی
خضر کی عمر کی ضرورت ہے
پھر بھی انصاف اگر نہ ہو آخر
حقِ مظلوم میں قیامت ہے
جیتنے پر بھی کوئی ہر جائے
اور ہارے اگر تو مر جائے

قارئین عظمٰی اس بات پر ہنس پڑیں گے کہ ایک بار اس درویش صفت انسان اور راہ چلتے وقت کسی کی طرف نظر نہ اٹھانے والی متفکر شخصیت نے اسکوٹر جیسی پُر خطر سواری کا سودا کیا۔ ڈگری کالج کے ہزاروں طلبہ، اساتذہ، خیر خواہ اور قصبۂ اسلام آباد میں ان کے مدآح پریشان تھے کہ کہیں خدانخواستہ کوئی حادثہ درپیش نہ ہو۔ لیکن ایک دن کالج گراونڈ میں پریکٹس کے بعد شوریدہ صاحب نیشنل ہائے وے پر نمودار ہو گئے۔ ایک بار اسی اسکوٹر پر کالج کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن کالج کے بجائے بٹنگو پہنچ گئے۔ ان دنوں کالج ہوسٹل بٹنگو میں ہوا کرتا تھا۔ کالج لڑکوں نے شوریدہ صاحب سے کہا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ کہا" کالج" لڑکوں نے عرض کیا کہ آپ کالج سے ایک کلومیٹر پیش قدمی کر چکے ہیں۔ اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا" اس

مزے دار اسکوٹر کو کیا ہو گیا، مجھے پتہ نہیں کہاں لے جا رہا ہے"۔ ۱۹۴۹ء کا عجیب وغریب واقعہ ایک دفعہ بیان فرمایا کہ اولڈ سکرٹریٹ سرینگر میں لوگ راشن کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ مرحوم وزیراعظم تھے۔ میں بھی کسی کام کے لیے وہاں موجود تھا، شوروشر، نعرہ بازی اور گتھم گتھا میں پولیس جرم بے گناہی میں اور میرے اونچے قد کی وجہ سے اور شک کی بنیاد پر گرفتار کر گئی۔ دس ماہ جموں جیل خانے میں گذارے یہ منظر ایک نظم میں یوں قلمبند کیا ہے۔

آزادگی کا دل میں آتا ہے وہ زمانہ
وہ گلستانِ کشمیر وہ اپنا آشیانہ
جس کے سبب یہ زنداں اپنا بنا ٹھکانہ
صیّاد ڈھونڈتا تھا پہلے سے وہ بہانہ
ایام گرمیوں کے پھر تنگ و تار حجرے
سنگین و سخت تر ہے جموں کا جیل خانہ
شوریدہ کو بھی ناحق پکڑا گیا ہے یارو
بیچارے کا ہے مسلک مدّت سے عاشقانہ

۱۹۸۲ء میں سفرِ بیت اللہ پر روانہ ہو گئے۔ ان دنوں سمندری سفر بہت ہی طویل اور جاں گداز ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے ہوائی سفر کے بجائے سمندری سفر کو ترجیح دی۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ اس سفر کی تیاری انہوں نے کس سلیقے اور یکسوئی کے ساتھ کی۔ چنانچہ سفر کی کیفیت، ہئیت اور عظمت کا احاطہ ایک غزل میں یوں کر چکے ہیں۔ چند شعر ملاخطہ ہوں۔

مکاں سے خدا کے مکاں جا رہا ہوں
میں مجذوب دارُالاماں جا رہا ہوں

حبیبؐ خدا کے یہاں جا رہا ہوں
کہوں کیا میں یارو! کہاں جا رہا ہوں
جہاں نور برسے جہاں طورؔ ترسے
جہاں اور ہی ہے وہاں جا رہا ہوں
ادھر پیری آئی ہے لیکن اُدھر میں
رواں و دواں و جواں جا رہا ہوں
بلاوا ہے حق اور محبوب حقؐ کا
دلا! میں کہاں سے کہاں جا رہا ہوں
وہاں سے میں شوریدؔ سرشار لوٹوں
یہاں سے تو آتش بجاں جارہا ہوں

کشمیر میں ادیب اور شاعر پیدا ہوتے رہیں گے لیکن شوریدؔہ صاحب جیسا بے ریا' بے باک اور درویش صفت بے نظیر سخنور کا پیدا ہونا محال لگ رہا ہے۔ اس لیے کہ عصر جدید میں اب ادب، شعر، تعلیم، تحقیق اور تنظیم میں ملاوٹ ریا' نفاق اور رعونت کے عناصر شامل ہو گئے ہیں۔

ہمدردیوں میں بھی تو ملاوٹ جناب ہے
یہ زندگی نہیں ہے مسلسل عذاب ہے

☆☆☆
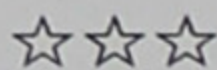
میر غلام رسول نازکی (وفات ۱۶ اپریل ۱۹۹۸ء)

وہ اپنی ذات میں اک انجمن تھے

کشمیر کی گذشتہ ایک صدی پر پھیلی ہوئی ادبی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے کئی پُر وقار شخصیتوں کے روز و شب، فکر و نظر اور وِجدان و اِدراک کی متفرق جہتوں، منزلوں اور رنگارنگیوں کا احساس بھی اور اعتراف بھی ہوتا ہے۔ ان شخصیتوں کی فِکر کے دائرے الگ، اثرات و احسانات کی نوعیت جُدا گانہ، اسلوبِ بیان کی انفرادیت متنوع، لیکن جو شخصیت کئی اعتبار سے ہمہ پہلو معلوم ہوتی ہے، اور اپنی ذات میں ایک انجمن دکھائی دیتی ہے وہ مرحوم و مغفور میر غلام رسول نازکی ہیں جو بیک وقت ایک قادرُ الکلام شاعر بھی ہیں، کلاسیکی ادب کے شیدائی بھی ہیں، نام نہاد جدیدیت کے مخالف بھی ہیں سماجی بیماریوں کے معالج بھی ہیں۔ سعدؔی شیرازی کا ثنیٰ بھی ہیں۔ عاشق قرآن بھی ہیں۔ بارگاہِ رسالتؐ کے مدّاح بھی ہیں۔ فطرت پسند بھی ہیں اور عجز وانکساری کے پیکر بھی۔ ان سارے اجزا و عناصر کو ایک دوسرے میں ضم کر دیجئے تو نازکی مرحوم کے وجود کا ہیولیٰ متشکّل ہوتا ہے۔

سَلف آسم سٹھاہ صالح نکو نکار

خَلف در اسک بہ جاہل احمق النّاس

علف زارس اندر زن چار ڈویاہ

تلف کر زم نہ کر زم کلمئی پاس

ترجمہ:۔ میرے اسلاف بہت ہی صالح اور نیکو کار تھے۔ میں انکی اولاد جاہل اور لوگوں میں بے وقوف بنکر نکلا۔ میری مثال چراگاہ کے حیوان کی سی ہے۔ اے اللہ مجھے برباد نہ کرنا، مجھے کلمۂ توحید کے توسط سے معاف کرنا۔

بانڈی پورہ کے مردم آفرین علاقے سے نازکی صاحب اصلاً وابستہ ہیں، جس کے متصل شہرہ آفاق جھیل ''گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یکدانہ'' کا اعتراف نوے سال پہلے شاعرِ مشرق نے کیا تھا۔ عبدالاحد نادمؔ، مؤرخ حسن شاہ، خانوادۂ فاضلی، پروفیسر رشید نازکی، جناب مفتی رحمت اللہ قاسمی اور دیگر علماء وفقہائے دارالعلومِ رحیمیہ اس دل کُشا خطۂ ارضی کے آفتاب ومہتاب ہیں۔

؎ چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک

گہر ہیں آبِ ولر کے تمام یکدانہ

بڑی شخصیات کی تخلیق وتعمیر میں دو عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ اکتسابی اور وہبی۔ کچھ لوگ مسلسل محنت، تگ ودَو، ریاض اور متواتر کوشش سے منزل تک رسائی ممکن بنا دیتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ وہبی طور پر صلاحیتوں سے آراستہ ہوتے ہیں اور انہیں مقام ومنزل تک پہنچنے میں زیادہ محنت کا سہارا نہیں لینا پڑتا ہے۔ نازکی صاحب مرحوم اکتسابی اور وہبی دونوں صلاحیتوں کے مجسّم دکھائی دیتے ہیں۔ بانڈی پورہ کے ایک اسکول سے رختِ سفر باندھ کر سرینگر کے مشاہیرِ علم و ادب میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوانا کوئی معمولی بات نہیں۔ محنتِ پیہم نے فکر ونظر کے جوہر جگمگائے اور پوری ریاست میں نازکی مرحوم شعر وادب کے ترجمان بن کر رہ گئے۔ رباعیاتِ ''نمرود نامہ'' عمرانی نقطۂ نگاہ سے انسانی فطرت، نفسیات اور مذہبیات کی حقیقی عکاسی

بھی ہیں، ذہانت وفطانت کے اعلیٰ نمونے بھی ہیں، شاعر کے اعلیٰ ادراک کے نشانِ راہ بھی ہیں اور محبتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لعل و گہر بھی ہیں۔

ے مدینک شام زلفن شانہ طُورس

مدینچ راتھ چشمن سورمہ نورس

مدینک صبح پرَ تو شش جہاتس

مدینک دوہ جلا دلکس حضورس

....

چُھ کعبس سنگِ اسود داغ سینس

عرق چھُس زمزمک پشپاں جبینس

سیٹھا ارماں چھُس بخشُس نہ ذاتن

شرف یُس تمی عطا کرمت مدینس

متذکرہ دونوں نعتیہ رباعیوں میں جامیؔ اور اقبال کا رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کشمیر میں جن لوگوں نے نعتیں لکھی ہیں وہ یقیناً عقیدت واحترام کی شہکار ہیں لیکن نازکی مرحوم کے ''نمرود نامہ'' کی رباعیاں اور ''چراغِ راہ'' کی ایک سو تیرہ رباعیاں دیگر شعرا کی نعوت پر کئی اعتبار سے منفرد نازک، لطیف، جذبۂ شوق میں غرق، اور اردوئے مُعلیٰ میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں ۔ یہ نعتیہ رباعیاں عقیدت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ علمی وفنی ندرتِ بیان کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ رباعیات آقائے دو جہاںؐ کے شکل وشمائل اور عادات واطوار کی چہرہ کشائی ہی نہیں، بلکہ آپؐ کے انسانی دنیا پر احسانات، اثرات اور برکات کا عالمانہ اِظہار بھی ہیں۔

زندگی کی سلگتی وادی میں
دفعتہً دور سے نظر آیا
آپؐ کی دلبری کا آبِ حیات
آپؐ کے لطف کا گھنا سایہ

....

آرزو ہے کہ زندگی گذرے
آپ کے شرح و دین و آئین پر
جب میں جانے لگوں یہاں سے کاش
آپ تشریف لائیں بالیں پر

....

لوگ کہتے ہیں جنّتِ کشمیر
حسن کے تاج کا نگینہ ہے
یہ میرے جسم کا وطن ہے مگر
میرے دل کا وطن مدینہ ہے

نازکی صاحب کی شاعری برائے شاعری نہیں بلکہ معاشرے کی مکمل منظوم مصوّری معلوم ہوتی ہے۔ بارہا مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سعدی شیرازی کچھ کہہ رہا ہے' کوئی حکایت سنانے جارہا ہے اور پند و نصائح کے موتی بکھیر رہا ہے۔ نازکی صاحب کے آخری مجموعۂ کلام ''کاوِ ییٔنہِ دول'' کی رباعیات کا شاعر ایک مفکّر اور ایک دانشور کے طور پر بات کرتا نظر آتا ہے۔ ہر مصرع دانشوری' دانائی اور دور اندیشی کا آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام کے سرچشمے قرآن'

احادیث، سیرت، تاریخِ اسلام، شعرائے فارسی و اردو کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ نازکی صاحب نے جن تشبیہات و تلمیحات کا استعمال کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکی نظر قدیم ادب پر بڑی گہری رہی ہے۔ رومیؔ، سنائیؔ، سعدیؔ اور اقبالؔ کے افکار و عقائد کو کئی مقامات پر نازکی مرحوم نے بہ حسن و خوبی منظوم پیرایے میں پیش کیا ہے۔ اقبال نے روایتی انداز میں نمازوں کی ادائیگی اور دلوں میں صنم آرائی پر جو شعر کہا ہے

جو میں سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

شعر کا منظوم ترجمہ نازکی صاحب نے کس قدر اثر انگیز انداز میں کیا ہے

میہ وون نکتاہ حکیمن، نے نوازن

طبیبن، مرشدن دانائے رازن

دلس چھُی قبلہ سا ساہ کعبہ ساساہ

میہ وتم کیاہ کرکھ پانژن نمازن

میر غلام رسول نازکی کے تصوراتِ فکر و نظر میں اوپر جن موضوعات کی طرف مختصراً اشارات کئے گئے، انکی اپنی جگہ اہمیت و افادیت بھی ہے اور معنویت بھی، لیکن انکی شاعری کا ایک اہم ترین موضوع تصورِ آخرت ہے۔ دراصل یہ علماً کا محبوب موضوع رہا ہے۔ انہوں نے نثر میں دنیا کی ناپائداری اور مال و متاع کے فریب کو موضوع بحث بنا کر عامۃ المسلمین کو دنیا پرستی سے روکنے کی ہر عہد میں کوشش کی ہے۔ ہزاروں مضامین میں علماً نے قرآن و حدیث کی روشنی میں اظہار خیال کیا ہے، اور زر پرستی و دنیاداری کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، نازکی صاحب بھی اپنی مناجات میں، اپنی رباعیات و قطعات میں پیرایے بدل بدل کر لیکن دین و دنیا کے توازن اور

''فی الدنیا حسنۃً و فی الآخرۃ حسنۃً'' کی شاندار دعا کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا تصورِ آخرت واضح کرتے ہیں۔ان کا تصور تمثیلوں اور دلیلوں کی بنیاد پر استوار ہے

جوانی ضایہ گیہٗ بیہودگی منز
ببر پر اَتھ ژھنم سگوِم دتری پوش
جوانی چھے خدا تھوِنے سلامت
نصیحت رٹھ مے کرٗ غفلت ژٔء کر ہوش

....

خدا بیزارٗ دنیا دار لوکن
اجل یِنہ برونہہ چُھ سوران دون اچھن گاش

مسلمانس چھُ دنیا حبسِ بے جا
یُتھے ییتہِ نیر زن نیر لیس پکھن واش

....

مکانک بامہ روشتی پور دنیا
دویہہ اُودرن لبن ہند بور دنیا
ہتس وریس تہِ ہر گاہ زندہ روزکھ
پتولاکن چھُ وانگج وور دنیا

....

نازکی صاحب کے پورے فکری نظام میں تصورِ آخرت کے یہ سائے جابجا منڈلاتے نظر

آتے ہیں، شاعر مشرق کے ساتھ نازکی صاحب کی عقیدت اور تعلقِ خاطر کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ ۹ نومبر ۱۹۸۶ء کو ہم نے اقبال اکیڈمی کشمیر کا پہلا جلسہ تاج ہوٹل میں کیا تھا۔ جلسے سے آل احمد سرور، حامدی کاشمیری، مرزا عارف بیگ، شوریدہ کاشمیری اور میر غلام رسول نازکی نے خطاب کیا تھا۔ نازکی صاحب نے قرآن پاک میں ذوالخرطوم کی اصطلاح کو اقبال نے کیسے برتا ہے، اس پر اظہار خیال کیا تھا۔ قرآنی تلمیحات اور اقبال پر کچھ جملے بیان فرمائے تھے، چنانچہ حاضرین مجلس نازکی صاحب کے علم و فضل سے محظوظ بھی اور متاثر بھی ہوگئے۔ ان کی شاعری پر جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے سعدی اور اقبال کا رنگ جابجا نظر آتا ہے، اس لیے کہ وہ اسی دبستان سے وابستہ تھے۔ اقبال کے اشعار کے منظوم ترجمے کرنا ان پر گراں گذرتا تھا۔ انہوں نے ۲۳ نومبر ۱۹۸۶ء کو بجبہاڑہ کے داراشکوہ باغ میں یوم اقبال کی ایک تقریب پر کہا تھا ''اقبال کا ترجمہ کرنا کوئی آسان عمل نہیں۔ اس کے لیے کہ کلام اقبال کے ترجمہ کار کا نہایت اعلیٰ درجے کا پڑھا لکھا ہونا از حد ضروری ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک بار اقبال کے ایک مترجم کے بارے میں انتہائی تلخ لہجے میں ایک رباعی بھی کہی جو غیر مطبوعہ ہے۔ وہ طنز و مزاج کے میدان میں کوئی بھی طنز اور تیر آزما سکتے تھے۔ مرحوم خواجہ محمد امین بچھ کی نو جلدوں پر مشتمل ڈائری میں نازکی صاحب کے بہت سارے ہجو یہ اشعار محفوظ ہیں۔ ان میں پروفیسر محی الدین حاجنی مرحوم کے متعلق ایک طویل فارسی میں تحریر کی گئی ہجو یہ نظم بھی موجود ہے۔

مرحوم نازکی صاحب کشمیر کے ایک مایہ ناز سخنور ایک عابدِ شب زندہ دار، ایک دانشور اور سب سے بڑھکر ایک ثناخوانِ رسولؐ تھے۔ وہ یقیناً اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

☆☆☆
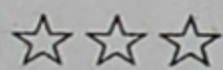
سلطانُ الحق شہیدیؔ......شبنمی اُداسیوں کا شاعر

سال ہا سال سے سرینگر شہر میں ایک ''شخص'' سے ادبی محفلوں، مشاعروں اور یونیورسٹی میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے سمیناروں میں اکثر میری ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ، شبنمی اداسی، شاعرانہ کم گشتگی اور کم گفتاری اس کا شعار تھی۔ معلوم نہیں وہ راقم کے ساتھ گفتگو میں قدرے بخل کیوں برتتا تھا۔ بہرحال مراسم پھر بھی قائم تھے۔ چند ماہ پہلے وہ اپنی دو کتابیں ''تیشۂ گل'' اور ''اِنکشاف'' لے کے میرے دفتر تشریف لائے دونوں مجموعوں کو دیکھ کر مجھ پر ایک بہت بڑی ''شخصیت'' کا فکر وفن منکشف ہوا، اور آج کی یہ تحریر اسی دلنواز شخصیت جناب سلطان الحق شہیدی کے شعری تجربات، مشاہدات اور احساسات سے متعلق ہے۔ ایک حقیقی شاعر اپنے گرد و پیش، اپنے وطن، اور اس وطن پر جو کچھ گذرتی ہے اس سے بیگانہ نہیں ہوتا ہے بلکہ اسکی آنکھ اور اس کا قلب وجگر اشکبار ہوتا ہے۔ شہیدی کے جذبات کا اندازہ ذرا ان اشعار سے لگایئے، جو کشمیر کی پُر درد تصویر کو دیکھ کر کہے گئے ہیں۔

؎ خراب وخستہ ودِلگیر ہوں میں
بس اتنا جانیے کشمیر ہوں میں
کوئی پہچان پائے گا تو کیوں کر؟
پھٹی بکھری ہوئی تصویر ہوں میں

ہوس رہ رہ کے مجھ کو نوچتی ہے
بڑی زرخیز اک جاگیر ہوں میں
لٹکتا ہوں صلیبِ زندگی پر
مری تقصیر؟ بے تقصیر ہوں میں

اقبالؒ کے مشہور مصرع ''خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے'' پر تضمین کرتے وقت شہیدیؔ کشمیر کے موجودہ آشوب اور کرب کی ساری کیفیتوں کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ شہیدی کی تضامین کو پڑھکر کشمیر کے ایک اور ذہین شاعر قاضی غلام محمد مرحوم یاد آئے جنہیں کشمیر کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا۔

ہمالہ کے چشمے ہیں میراث اپنی
یہ دریا یہ جھرنے ہیں میراث اپنی
بدلتے نہیں ہیں مگر اپنے دھارے
''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے''

☆☆☆

ہیں سنسان جنگل تو ویران صحرا
کسی نے بٹھایا ہے کیا ان پہ پہرا
ہیں شہروں کے سب لوگ گونگے بچارے
''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے''

☆☆☆
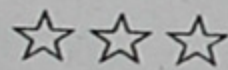
یہ اقبالؔ وانورؔ کے خوابوں کی بستی
نہاں خاک میں آفتابوں کی بستی
مظالم بہرگام کب تک سہارے
''خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے''

شہیدی صاحب کے دونوں مجموعوں میں کشمیر کا فطری حسن جا بجا جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔
''تیشۂ گل'' اور ''انکشاف'' کی نظموں اور غزلوں کے مطالعے سے لطف اندوز ہونے کے دوران قاری نادر استعاروں اور پیکر تراشی کے عمدہ نمونوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔
پیکر، شعری حسن کاری کا ایک ذریعہ ہے، جس کا تعلق تخیل و وجدان سے ہے اور اس کا مقصد شعر کی اثر آفرینی کو دوبالا کرنا ہوتا ہے۔ شہیدی کے تصورات اور مشاہدات کی دنیا وسیع تر ہے اور کشمیر کے اُردو شعرا میں وہ شعری حسن کاری و پیکر تراشی میں ایک انفرادیت رکھتے ہیں انہوں نے امیج یا پیکر کوئی جہتوں سے آشنا بھی کیا ہے اور کامیابی کے ساتھ برتا بھی ہے۔

ؔ زندگی ہے ایک بحرِ بے کراں کا اضطراب
ہو سکے حاصل سکوں جس پر یہ وہ ساحل نہیں
ہے حقیقت میں ہماری جستجوئے روز و شب
ایسی اک منزل کی خاطر جو کوئی منزل نہیں
حسرتیں ہیں آرزوئیں ہیں وفا کے ساتھ ساتھ
جیسے کہہ دوں میں کہ میرا دل بھی اک محفل نہیں

شہیدیؔ نصف صدی سے زائد عرصے سے وادیٔ شعر کی آبلہ پائی کی رسم انجام

دے رہے ہیں۔ سماج کی قدروں میں تغیرّ وتبدّل، روایات کا تنزل، اور احساسات میں تفاوت کے سبھی اجزا ان کے اشعار میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ شعر معاشرے کی ایک قدیم اور منفرد قدر رہے۔ اکثر اوقات اس کا ارتقا معاشرے کی مادّی بنیادوں کے متوازی نہیں ہوتا۔ اس کا معاشرے کے جملہ مراکز اور اعمال وافعال کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سماجی شعر شاعری کی ایک قسم ہے جس میں ہماری باہمی زندگی کے آثار ونقوش موجود ہوتے ہیں۔ شہیدی محسوسات کی شدّت وحدت کے رقصِ آتشیں میں خود آگہی، خود شناسی اور خودنگری کے لیے کوئی بھی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہیں۔ اس غزل کے یہ چند اشعار شہیدی کے باطن میں موجود تلاطم اور تموج کے غماز نظر آتے ہیں۔

گلشن میں ایک سروِ ہی تھا بہت بلند
کیا کہیے شاخ شاخ وہی ٹوٹتا لگے
کیوں کر یقین نہ آئے گا قتلِ حسینؑ پر
جب اپنا شہر ہی مجھے اک کربلا لگے
اہلِ وطن سے دوست مجھے کچھ گلا نہیں
خود آگہی کی جو بھی ہو مجھکو سزا لگے
ہے آتشِ سیال ہر اک برگ سبز سبز
اے دوست یہ ثبوت تو جل کر مگر ملے

''تیشۂ گل،، پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے معروف اُردو نقاد پروفیسر قدوس جاوید نے شہیدی صاحب کی غزل گوئی کے جملہ اجزا و عناصر کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے موصوف کے محسوسات کی رنگارنگی اور شدت کو یوں داد و تحسین پیش کیا ہے ''سلطانُ الحق

شہیدی بنیادی طور پر محسوسات کے شاعر ہیں لیکن ان کے محسوسات، مختلف النوع تجربات کی شکل میں اس طرح سامنے آئے ہیں کہ ان کے اشعار ٹھوس اور وجدانی معنی کا اخراج نہیں کرتے بلکہ کیفیت وتاثر کے لامحدود امکانات کو تمام تر لسانی، فنی اور جمالیاتی محاسن کے ساتھ بے نقاب کرتے ہیں۔ اسی لیے شہیدی کی شاعری عام بیان سادہ تعبیر و توضیح کا بیان نہیں بنتی بلکہ شاعری ہی رہتی ہے اچھی اور عمدہ شاعری''۔

سلطانُ الحق شہیدی ایک پختہ کار مترجم بھی ہیں۔ انہوں نے علامہ اقبال کے ارمغان حجاز اور پیام مشرق کی رباعیات کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ جو جناب رؤف خیر کے ''قنطار'' اور عبدالعلیم صدیقی کی ''نوائے شرق'' میں ہوئے منظوم تراجم سے کئی مواقع پر زیادہ بہتر اور خوب تر معلوم ہوتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہیدی صاحب جس پذیرائی کے مستحق ہیں، انکو آج تک وہ نہیں ملی ہے، شاید اس میں ان کے مزاج میں موجود لا ابالی اور استغنا ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ کشمیر کے اس بے نظیر سخنور کی ریاستی اور ملکی سطح پر ایسی عزت افزائی ہونی چاہئے جس کے وہ مستحق ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری کے ان الفاظ پر اپنی تحریر اختتام پذیر کرتا ہوں۔

''انکشاف''،''تیشۂ گل''،'' برگ برگ''، ریاست کے نامی گرامی شاعر سلطان الحق شہیدی کے تین شعری مجموعے ہیں۔ مہر عالم تاب کا یہ منظر دیکھ کر میں شاعری کے الہامی کردار یا اس کے عطیۂ الٰہی ہونے کا قائل ہوگیا۔ اور پھر جب فرصت میں ان کے کلام کو پڑھتا رہا، میری حیرت اور مسرت میں اضافہ ہوتا رہا.........شہیدی صاحب خودشناس اور جہاں بین شاعر ہیں اور ان کے شعری مجموعوں سے اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ وہ نفس نفس تخلیق شعر کے لیے وقف کر چکے ہیں''۔

خواجہ غلام حسن نحویؔ......انقلابی آہنگ کا شاعر

ہر زبان وادب میں شاعروں کے اندر ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہوتا ہے، جو طبقاتی کشمکش، سماجی نابرابری اور ظلم وزیادتی سے متعلق موضوعات کو اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔ بسا اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ انقلاب، بغاوت، تغیرّ، تبدیلی، اور روایات سے کلی انحراف شعرأ کا کلیدی موضوع رہا ہے، اگر چہ یہ صنعتِ شاعری کے فکری مرکز سے زیادہ قربت نہیں رکھتا ہے۔ شاعر مشرق اقبال بھی تغیرّ کے حامی اور جمود کے مخالف ہیں۔ رنگ ونسل کے امتیازات کو وہ بھی ناروا گردانتے ہیں، غرض شاعری میں انقلاب واضطراب کا عنصر اکثر شعرأ کے ہاں موجود ہے۔

کشمیر کے اُردو اور کشمیری شعرأ میں مہجورؔ، آزادؔ، عارفؔ، نادمؔ، فاضلؔ، نازکیؔ، مشتاقؔ، اور نحویؔ کے یہاں انقلابی نغمے سماجی بیداری کے ترانے اور استحصال سے آزادی کے اشعار جابجا ملتے ہیں۔ ان شعرأ کا کلام شخصی راج کے نظام کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

اے ہری سنگھ نواہائے شرربار سے ڈر
وقت اور وقت کی بدلی ہوئی رفتار سے ڈر
اپنے محلوں کی ڈھڑکئی ہوئی بنیاد کو دیکھ
اپنے آغاز کے انجام سیہہ کار سے ڈر

خواجہ غلام حسن نحوؔی بنیادی طور پر فطرت پسند شاعر ہیں۔ ڈیڑھ سو اشعار پر مشتمل فارسی میں انکی تحریر کردہ نظم ''خطاب بہ کشمیر'' ان کے اپنے وطن کی ظاہری وباطنی خوبیوں اور خوبصورتیوں کی ترجمان ہے، لیکن فطرت پسندی اور محبتِ نبیؐ کے پُر خلوص جذبات کے ساتھ ساتھ وہ قومی بیداری، سماجی زبوں حالی اور پسماندگی کے عنوانات کو پوری شدت کے ساتھ بروئے کار لاتے ہیں ١٩٤٠ء کی دہائی میں جب برطانوی استبداد کے خلاف ہندوستان میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی اور پورے برصغیر میں ماحول نئی تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہورہا تھا، تو نحوؔی صاحب اپنے احساسات کو یوں قلمبند کرتے ہیں۔

ووتھ انقلابکہ ہا عَلَم برادار جوانو
نوو مشرقی دنیا سپُد بیدار جوانو
باطل مٹاون چھِی پزیک دنیا ژ بساون
پانے بناون چھُی نُووی سمسار جوانو
اکہ زلزلہ الہٕ راو ژ سرمایہ پرستی
پزِ ولولہ سیتن ژ اَن یلغار جوانو
مشعالہ زالتھ کر ژ روشن ظلمہٕ کی ظلمات
ییہ شولہِ وطن باغ تے گُلزار جوانو
کرِ فخر ییہ تاریخ چانن کارنامن پیٹھ
پرِ پانہٕ نحوی تازٕ تر اشعار جوانو

شاعر اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ ظلم و زیادتی، حقوق کی پامالی اور نابرابری کے واقعات پر خاموشی اختیار نہیں کر سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں نحوی صاحب کی نظم ''پسماند طبقن ہُند فریاد'' ان کے شدید جذباتی ردِ عمل کی عکاسی کرتی ہے۔ یہاں اس طویل نظم کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

یہِ کیاہ بُنلاہ تہٕ واوہ تیز ناراہ
چُھنا پسماندٕ طبقن داد ی داراہ
بو پتھ رودس میہ ما آسم رسائی
مے کژ گیٔے بندگی تس گیہٕ خدائی
یہ کیاہ اَنراہ تہٕ مژراہ سازٕ بازا
یہٕ گوو ننہ وانہٕ نسلی اِمتیازا
رٹو نوٕ وتھ تہٕ روز وکیا زٕ ہارتھ
وچھو دنہٕ گوو نہٕ کھاسن ماچھ لارتھ
سیدن سادن کراں چالاک گمراہ
ونستامتھ کھوتا سینٕز اونگجہ گیوزاہ

آشوبِ زمانہ، حالات کی ستم ظریفی، ناانصافی، فریب کاری بد دیانتی تب بھی سماج میں عام تھی، اور موجودہ زمانے میں اس میں زیادہ ہی اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔

تب کچھ قدریں پھر بھی قائم تھیں ، اب تو قدروں کا بیڑا غرق ہو چکا ہے ۔نحوی صاحب معاشرے میں انصاف کے فقدان کا رونا روتے ہیں ، ایمان کے ناپید ہونے کا ماتم کرتے ہیں۔

پُھم میہ ژکھس اکھ کتھ یتہٕ باونی
گو نماتن منز یُن چُھ بہاناہ
گام تہٕ موقدم ساتی میہ آسم
ییلہ انصاف کاژ تمنبر پییٔے
واڈ تہٕ ڈونی گُل توتی تمی نیوو
نچھے نیا یک رُود فسانہ

نحوی صاحب کے کلام پر ایک نظر ڈالنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے ، کہ وہ انقلابی مزاج کے سخنور تھے ، اگر چہ اپنے ساٹھ سالہ علمی ، ادبی اور تبلیغی سفر میں انہوں نے ذرائع ابلاغ کا کبھی سہارا نہیں لیا ، اور اپنے سینے میں دبی اس انقلاب کی آگ دبائے رکھی۔

☆☆☆

کشمیر یونیورسٹی کا ایک نابغۂ روزگار اُستاد

پروفیسر قاضی غُلام محمد مرحوم

۱۹۷۰ء سے لیکر ۱۹۹۰ء تک کشمیر یونیورسٹی قومی اور بین الاقوامی سطح کی قبولیت کے حامل دانشوروں، محققوں اور مدرّسوں کا ایک گہوارہ تھی، جو واقعی علم وادب کے اساتذہ اور میدانِ تدریس وتحقیق کے شہسوار تھے۔ انکی صحبت، محبت، صلاحیت اور شوقِ علم سے طلبہ کے فکر ونظر کو مہمیز ملا کرتی تھی اور ان کے ''فنافی العِلم'' ہونے کی کیفیت سے راہِ علم کے مسافروں اور تحقیق وتدقیق کے متلاشیوں کو ایک نئی روشنی، گرمی، تازگی اور توانائی حاصل ہوکرتی تھی۔ ان عظیم المرتبت اساتذہ میں پروفیسر آلِ احمد سرور، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر محمد سلطان وانٹ، پروفیسر ٹی۔ جے۔ رمن، پروفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر شمس الدین احمد، پروفیسر رحمان راہی، پروفیسر مرغوب بانہالی، پروفیسر کاچرو، پروفیسر رینہ، پروفیسر فوطیدار، پروفیسر شیروانی، پروفیسر شرما، پروفیسر شاہد صدیقی، پروفیسر ریاض پنجابی، پروفیسر ایم وائی قادری اور پروفیسر مرحوم قاضی غلام محمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہ چند سطور کشمیر یونیورسٹی کے ایک ممتاز استادِ ریاضی، معروف شاعر، حافظِ کلامِ غالبؔ، اور بذلہ سنج جناب مرحوم قاضی غلام محمد کی یاد میں تحریر ہورہی ہیں، جسکو اپنے وطنِ مالوف کشمیر کے ذرّے ذرّے سے پیار تھا لیکن کارخانۂ قدرت کے انداز انسانی فکر سے بالاتر ہیں کہ کشمیر کا یہ شیدائی غریبُ الوطنی میں انتقال کر گیا اور انہیں سرکاس امریکہ کی ایک مسجد کے

صحن میں ۴ فروری ۱۹۹۹ء کو مدفون کیا گیا اور بقول ڈاکٹر محمد اشرف بیگ کہ ''جو کوئی مسجد سے نماز پڑھ کے باہر آتا ہے تو وہ ضرور قاضی مرحوم کی قبر کو دیکھ کے ان کے حق میں دعائے مغفرت مانگتا ہے''۔ قاضی صاحب بنیادی طور پر ایک نہایت ہی دقیق مضمون ریاضیات کے مستند استاد تھے۔ بی۔اے میں فارسی بھی بطور ایک مضمون کے چن لیا تھا، جس کا اثر اس قدر حقیقی اور قوی تھا کہ مرحوم کشمیر میں شاید پہلے عاشقِ غالبؔ تھے جنہیں غالبؔ پورا اردو اور فارسی کلام از بر تھا۔ پوری ریاست میں گریجویشن میں پہلی پوزیشن پانے کے صلے میں انہیں محکمۂ جنگلات میں ایک بڑے عہدے کی پیشکش کی گئی تھی لیکن شرابِ علم کی لذت انہیں کشاں کشاں علیگڈھ پہنچائی اور بقولِ ان کے ایک دوست ''روانگی کے دن بانہال کی بلندی سے وادی کو اشکبار آنکھوں سے وداع کیا''۔ علی گڈھ سے ایم۔اے کرنے کے بعد قاضی صاحب یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی میں لکچرر تعینات کئے گئے۔ اسلام آباد سے روزانہ بس کے فرنٹ سیٹ پر متمکن ہو کر بیس سال تک لاکھوں مسافروں کے مزاج اور ہزاروں ڈرائیوروں کی نفسیات پر رواں دواں کومینٹری بیان کرنے والے قاضی مرحوم شاید ہی کبھی ایم۔اے کی کلاس لینے سے قاصر رہ چکے ہوں۔ کلاس چھوٹ جانا ان کے نزدیک گناہِ کبیرہ تھا، کیونکہ وہ اپنے پیشے کی عظمت سے آگاہ تھے۔ آج کل کے کام چور استادوں اور نام نہاد محققوں کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ روزانہ کے طویل اور تھکا دینے والے بس سفر پر ان کی مزاحیہ نظم اردو مزاح نگاری میں ایک عمدہ مثال ہے۔ پوری نظم کو یہاں پیش کرنا ممکن نہیں تاہم قارئین کے تفننِ طبع کے لیے کچھ بند پیش خدمت ہیں۔

؎ شہر جانا تھا مجھے درپیش تھا بس کا سفر
صحبتِ ناجنس سے ممکن نہ تھا ہرگز مفر

ہم نشین میرا جو موٹا تھا باندازِ دگر
سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جیسے لنگر ڈال کر
میری حالت دیکھ کر کہنے لگا وہ نکتہ سنج
''رنج سے خوگر ہو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج''

جو کھڑی تھیں بس کے بیچوں بیچ مچھلی والیاں
سیٹ پر بیٹھے ہوؤں کو دے رہی تھی گالیاں
منچلے جو تھے بجاتے تھے وہ مل کر تالیاں
دید کے قابل تھیں ہم اشراف کی بدحالیاں
یوں کھڑا تھا بس میں لوگوں کا وہ بے قابو ہجوم
''ہم مُوحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم''

مختصر کرتا ہوں اب اپنے سفر کا ماجرا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
منزلِ مقصود تک پہنچا تو میں اٹھنے لگا
سینگ بکرے کا مگر پتلون میں ایسا پھنسا
سیٹ سے اٹھنا نہ تھا آساں و لے کوشش تو کی
اس کشاکش میں مری پتلون آدھی رہ گئی

بس سے میں اُترا تو میرا حال تھا نا گفتنی
مرا حُلیہ دیکھ کر کتوں میں پھیلی سنسنی

منزلِ مقصود تک پہنچا تھا قسمت کا دھنی
چال میں تھی لڑکھڑاہٹ اور قد تھا منحنی

"جان کر منجملۂ خاصانِ میخانہ مجھے"
لے گئے پولیس والے جانبِ تھانہ مجھے

مجھے سینٹور ہوٹل کا وہ اردو مشاعرہ یاد آ رہا ہے جو ستمبر ۱۹۸۶ء میں منعقد ہوا تھا اور اس وقت کے ریاستی گورنر شری جگموہن اس موقع پر بطورِ مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔ دعوت کلام کے لیے ناظمِ مشاعرہ جناب آل احمد سرورؔ نے جب قاضی غلام محمد صاحب کا نام لیا تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ قاضی صاحب جگموہن کی طرف یوں مخاطب ہوئے

میں تری سالگرہ پر تجھے کیا پیش کروں
جو مرے پاس ہے اے دوست وہ "سرکاری" ہے
ڈالڈا جزوِ رگ و پے تو ہوا ہے لیکن
اب تو جذبات سے بھی گھاس کی بُو آتی ہے

قہقہوں، تالیوں اور "مکرر" کی آوازوں سے کئی منٹ تک ہال زعفران زار بن گیا۔ طنز، طنزِ ملیح اور تضمین میں قاضی صاحب کا اندازِ انوکھا، تہہ دار اور قہقہ زار ہوتا تھا۔

آپ کا انتظار کون کرے
شیو اب بار بار کون کرے
ضبطِ تولید کا زمانہ ہے
پیار مردانہ وار کون کرے

گنگناتے ہیں یاد کے مچھر
شکوۂ ہجرِ یار کون کرے
گھاس کی بو نفس نفس میں ہے
ڈالڈا کھا کے پیار کون کرے

حاضر جوابی، بذلہ سنجی، نکتہ رسی اور پیراڈی (Parody) میں مرحوم قاضی صاحب بے بدل تھے۔ ایک معتبر راوی نے ایک بار واقعہ یوں سنایا کہ شعبۂ اردو کے لان میں پروفیسر راہی صاحب نے قاضی غلام محمد سے کہا کہ آپ کی ذکاوت و فطانت مسلّمہ ہے۔ میرے ایک مصرع پر فی البدیہہ گرہ باندھیے۔ راہی صاحب نے مصرعہ پڑھا

چلن زمانک ژٕ پرزنووتھ مانی کوڈ فتنکس اشارس

قاضی صاحب بغیر کسی تامُّل اور توقف کے بولے

قمیضہِ میانی بٹن ژ تورتھ میہ ڈور دِژ یزارس
بلاءِ لگہ ہےیی ہن تہ وتم چھُ کوت تنخواہ میہ بالہ یارس

راقم اور قاضی صاحب ایک بار نسیم باغ سے گذر رہے تھے، میں نے اقبال کا وہ مشہور شعر پڑھا

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

اور اس پر کسی دوسرے شاعر کے شعر سے اس کا موازنہ کرنے کی گذارش کی۔ انہوں نے وضاحت بھی کی اور پر لطف تضمین بھی کی۔ کہنے لگے

کبھی اے حقیقتِ مختصر نظر آ لباسِ دراز میں

اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فراغت پانے والے ایم۔ اے اردو اور پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری یافتہ حضرات کی ادبی، تحقیقی اور علمی کم مائیگی کا بھرپور مذاق اڑاتے ہوئے وہ اختر شیرانی کی مشہور

نظم ''او دیس سے آنے والے بتا'' کے اشعار

ے کیا اب بھی وہاں کے مندر سے ناقوس کی آواز آتی ہے

کیا اب بھی مقدس مسجد سے مستانہ اذاں تھراتی ہے

پر یوں گرہ باندھتے تھے

ے کیا اب بھی وہاں کا ہر ایم اے غالبؔ پر کچھ فرماتا ہے

کیا اب بھی وہاں کا گنجا سر اِسکالر سمجھا جاتا ہے

چند سال پہلے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ سے ''کشمیر میں اردو'' کے موضوع پر راقم کو گفتگو کرنے کا موقعہ فراہم ہوا۔ پروفیسر عتیق اللہ ان دنوں صدر شعبۂ تھے۔ تقریب کی صدارت ملک کے مشہور اردو محقق پروفیسر محمد حسن کر رہے تھے۔ دورانِ تقریر جب میں نے قاضی غلام محمد کا نام لیا اور ان کے مجموعۂ کلام سے چند اشعار سنائے تو محمد حسن قدرے بے چین سے ہو گئے اور تقریب ختم ہونے کے بعد بار بار قاضی صاحب کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا ذکر کرتے رہے۔ بدقسمتی سے مزاج میں لا اُبالی پن اور اردو ادیبوں اور شاعروں کی استحصالی ذہنیت، مشاعروں میں بیہودہ گوئی اور ادبی چھچھورے پن سے وہ نالان تھے اور یونیورسٹی سے باہر ادبی محفلوں میں شمولیت سے احتراز کرتے تھے۔ وہ شاید ہی کسی ریڈیو یا ٹی۔ وی مشاعرے میں شریک ہوئے ہوں گے، اس لیے کہ قاضی صاحب کا معیارِ شعر حافظ سعدی، غالب، خیام اقبال اور کولرج تھا۔۔ اساتذہ شعرا ٔ کا بیشتر کلام انہیں یاد تھا اور کسی بھی مرحلے پر وہ ان کے کلام سے استدلال کر سکتے تھے۔ ایک بار میں نے انکی بیماری کے ایاّم میں طبیعت کا حال پوچھا تو عمر خیام کی ایک رباعی سنائی جس میں خیام اللہ کے حضور شکوہ سنج ہے کہ اے خدا جس دن آسمان پھٹ جائے گا، جس دن تاروں کی روشنی ماند پڑ جائے گی یعنی قیامت کے دن

میں تیرا دامن پکڑوں گا کہ اے محبوب مجھے کس جرم میں تو نے مار ڈالا۔

روزے کہ بود اِذَالسّمَاءُ انْشَقّت

واں دم کہ بود اِذ النّجومُ انکدرَت

من دامنِ تو بگیرم اندر عرصات

گویم صنما، بِاَیِّ ذَنبٍ قُتِلَتُ

قاضی صاحب کی زبردست ذہانت اور جدتِ نظر کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ عمر خیام کی شاعری کے اشعار سے جیومیٹری میں Cubic (ثُلث) کا حل تلاش کرتے ہیں۔ انگریزی میں ان کا تحریر کردہ مقالہ Omar Khayyam and Solution of the Cubic ریاضی کے اس نابغۂ روزگار استاد کی فکری استعداد کا غماز ہے۔ قاضی صاحب چاہتے تو اپنے دونوں بچوں کو ڈاکٹری یا انجینئرنگ کرواتے لیکن پوری زندگی جس مضمون کو کلاس میں سو فیصد دیانت داری کے ساتھ پڑھاتے رہے، اسی مضمون میں اپنے بیٹے اور بیٹی کو امریکہ کی ایک یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کا بیٹا ڈاکٹر قاضی داوٗد صاحب اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی میں پڑھاتا ہے اور انکی صاحبزادی ڈاکٹر فوزیہ صاحبہ اسلامک یونیورسٹی اونتی پورہ میں شعبۂ ریاضی سے وابستہ ہیں۔

آج جب ہم اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تمام جدید سہولیات، مراعات، آلات اور انتظامات دیکھتے ہیں تو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ طلبہ اور محققین کی تعداد آئے دن بڑھ رہی ہے۔ یونیورسٹی اور کالج اساتذہ کو نہایت ہی معقول تنخواہیں مل رہی ہیں، لیکن پروفیسر قاضی غلام محمد، پروفیسر ایم۔ وائی قادری، پروفیسر پنڈتا، اور پروفیسر سرور جیسے روشن دماغ، پرخلوص، تعلیم و تدریس سے حقیقی معنوں میں جڑے ہوئے استاد نظر نہیں آتے ہیں۔ آج ہماری دانشگاہوں کا حال یہ ہے کہ جن

اصحاب کو کتب خانوں، تحقیقی مرکزوں، تجربہ گاہوں سمیناروں اور ادبی محفلوں میں پیش پیش ہونا چاہئے تھا وہ تنخواہوں، ٹی۔اے۔ڈی۔اے کی بلوں امتحانی پرچوں کی مارکنگ، انتظامی عہدوں کی تلاش، بقایاجات کی واگذاری میں سرگردان نظر آتے ہیں۔ان چیزوں کی اہمیت اوران رعایتوں کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن یونیورسٹی اور کالج اساتذہ کا مقام ان سطحی چیزوں سے نہایت بلند تر ہے۔

مجھے اس وقت وہ واقعہ یاد آرہا ہے جب دسمبر ۱۹۸۸ء میں میرا تقرر بحثیت لکچرر کے شعبۂ اردو میں ہوا تھا، تو پروفیسر قاضی صاحب نے ماتھا چوما، مبارکباد دی اور ازراہِ نصیحت مجھ سے کہا۔ ''یونیورسٹی میں جو بھی اور جب بھی کوئی لکچرر تعینات ہوجائے کشمیر کی ساٹھ لاکھ کی آبادی میں اسکا کوئی ہمسر نہیں ہونا چاہیے''۔اس جملے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم کا اعلیٰ تعلیم کے بارے میں کیا نقطۂ نظر تھا۔اپنی تیس سال کی شاندار تدریسی زندگی میں پروفیسر قاضی غلام محمد نے ہزاروں طلبہ کو ریاضی کے علوم سے بہرہ ور کیا اور جب بھی ان کے کسی شاگرد سے ان کے بارے میں بات ہوتی ہے تو وہ احترام، عقیدت اور قلبی وابستگی کے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ کشمیر یونیورسٹی کے باضمیر اور فرض شناس اساتذہ کی تاریخ جب بھی مرتب ہوگی، مرحوم قاضی صاحب کی تدریسی خدمات اور اعلیٰ درجے کی ادبی استعداد کو آبِ زر سے سپرد قلم کیا جائے گا۔

☆☆☆
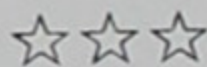
تعلیمی نظام......معیار و میزان میں اِدبار و زوال
ماہرین اور منتظمین کے لیے لمحہ ٔ فکریّہ!

عہدِ حاضر کے اقوام کی ہمہ گیر ترقی کا راز تعلیم اور تحقیق کے شعبوں میں انکی محنت' ریاضت' توجّہ اور اِرتکاز میں مضمر ہے۔ مغربی قومیں اور انکی درسگاہیں آج پوری دنیا کی شہ رگ کو اپنی گرفت میں لے چکی ہیں ۔ مغرب میں علوم وفنون اور تہذیب وتمدّن میں نشاۃُ الثانیہ کے ساتھ ہی وہاں کے عالموں' دانشوروں اور ماہرینِ تعلیم نے اپنی ساری توجّہ نظامِ تعلیم کو مضبوط بنیادوں پر اُستوار کرنے پر مرکوز کی' اگر چہ یہ بنیادیں مادّی' سیکولر اور ابراہیمؑی تصوراتِ زندگی کے اِمتزاج و اِختلاط پر قائم ہوئیں۔ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے ساٹھ سال سے زائد عرصہ بیت گیا' لیکن پورے ہندو پاک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں چرچ کے اندر استعمال ہونے والے الفاظ واصطلاحات اب بھی مستعمل ہیں' مثلاً لیکچرر' ریڈر' ڈین' تھیسز کلرک وغیرہ۔ بظاہر اہلِ مغرب نے اپنے نظامِ تعلیم سے مذہب کو علٰحدہ کرنے کی بات کی لیکن بہ باطن پورا نظامِ تعلیم یہودی اور عیسائی فکر کے عناصر سے تربیت پا رہا تھا۔ اِس خطّے کی تمام یونیورسٹیوں میں اب بھی اعلیٰ تعلیم وتربیت کے لیے ایک سال کی تعطیل مع رعایات کے دی جاتی ہے جسے SABATICAL LEAVE کہا جاتا ہے۔ یہ یہودیوں کے مقدس دن ''اَلسَّبت'' (Saturday) سے جڑی ہوئی چھٹی ہے۔ سو سال پہلے علامہ اقبالؒ نے مغرب کے نظامِ تعلیم کی روح کو سمجھ کر یہ بات کہی تھی۔

؎ اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم

ایک سازش ہے فقط دین ومروّت کے خلاف

مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کئی خامیوں کے باوجود یورپ میں اس وقت جو نظامِ تعلیم رائج ہے، اس میں محنت، خونِ جگر، جذبۂ تحقیق، تخلیقیت، جدید حسیّت، عوامی خدمت، اور بھرپور تربیت کا احساس موجود ہے، اور برعکس اس کے ہماری تعلیم، تحقیق اور تربیت ایک بے جان روایت، ایک رسم ایک مصروفیت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، اور اس شعبے کا ایک ایک گوشہ انتہائی افسوس ناک صورت اختیار کر چکا ہے۔

؎ تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو

ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

تاثیر میں اِکسیر سے بڑھکر ہے یہ تیزاب

سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

راقم الحروف گذشتہ تیس برسوں سے براہِ راست اعلیٰ تعلیم کے سب سے بڑے مرکز کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ ہے۔ ان تیس برسوں میں چند سال سرینگر دوردرشن میں علمی، ثقافتی، مذہبی اور معاشرتی پروگراموں کی ترتیب وتخلیق میں گذر گئے، چنانچہ اعلیٰ تعلیم اور دوردرشن کے ساتھ وابستگی پر مبنی تجربات مشاہدات اور محسوسات کو میں اپنی ایک زیرِ ترتیب کتاب میں تفصیلاً پیش کروں گا، اور اس وقت صرف ریاستِ جموں وکشمیر میں رائج نظامِ تعلیم کو درپیش مسائل اور اس سلسلے میں چند معروضات اور تجاویز پر ریاستی انتظامیہ اور شعبۂ تعلیم سے وابستہ ذمّہ داروں کو سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ غور کرنے کی توقع کروں گا۔

نظامِ تعلیم میں ''تناسب اور توازن'' قائم کرنے کے لیے چند امور کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اولاً ہمارے نظامِ تعلیم کو پختہ بنیادوں پر استوار ہونا چاہیئے تھا۔ ہماری تعلیمی پالیسی صرف روزگار کے وسائل پیدا کرنے، معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے، زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے اردگرد گردش کرتی نظر آرہی ہے، ان ضرورتوں سے اِغماض نہیں برتا جا سکتا ہے، یقیناً ایک سوسایٹی میں روزگار کے بہتر ذرائع و وسائل موجود ہونے لازمی ہیں، لیکن انسان دوستی، انسان سازی، اور انسانیت کی بے لوث خدمت کو پسِ پشت ڈال کر فقط شکم سیری کے لیے تعلیم کو عام کرنا ایک مذاق سے کم نہیں۔ شعبۂ تعلیم ہمارے پورے نظام کا ایک قابلِ قدر جُز اور اُستاد اس نظام کا سب سے اہم رکن ہے، لیکن دیانت داری سے اگر موجودہ حالات میں اس نظامِ تعلیم کا محاسبہ کیا جائے تو اس کا تقدس جو انسان سازی کے اصولوں پر قائم ہو چکا تھا، اور جس کی ایک انتہائی حیران کن تاریخ تھی، ہمارے یہاں ایک دھندا، ایک دھوکہ، ایک فراڈ، ایک فریب اور ایک سراب سے کم نہیں۔ نرسری سے پی۔ ایچ۔ ڈی تک اس نظام کو چلانے والے فکری اعتبار سے دیوانہ پن کا مظاہرہ کرتے نظر آرہے ہیں۔ عجیب وغریب قسم کے نصابات، درسیات اور شخصیات کا طومار یو۔ کے جی سے آٹھویں تک تمام انگریزی اسکولوں کے بچوں کی نظروں کے سامنے دن بھر رقص کرتا نظر آرہا ہے۔ ذہنی طور خام، جسمانی طور پر ابھی پرورش کے مرحلوں سے گذرنے والے بچوں کو بیک وقت بارہ مضامین کے زیرِ بار کرنا کہاں کا نظامِ تعلیم ہے؟ اور اس پر طرہ کہ مختلف انگریزی میڈیم اسکولوں کے ماہرین ایک سے بڑھکر ایک ''معیاری'' کتاب شاملِ نصاب کر کے نئی راہوں کی رہبری کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے ایک انگریزی اسکول کی ابتدائی کلاسوں کی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کو پڑھانے والے میٹرک، بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی اور ایم۔ اے پاس

اساتذہ کیا پڑھاتے ہوں گے، اور وہ چھوٹے بچوں کو سمجھاتے وقت کون سا ذریعۂ اظہار اختیار کرتے ہوں گے، مثلاً ایک انگریزی اسکول کی چوتھی جماعت کے بچوں کو انگریزی سے مانوس کرنے اور اس میں زبردست مہارت پیدا کرنے کے لئے "The Land of Thus-And-So" نام کی کتاب مقرر کی گئی ہے، یہ James Whitecomb کی مرتب کردہ ہے۔ کتاب کی تمہید ان جملوں سے شروع ہوتی ہے۔

The Land of Thus-And-So (LTS) represents an endeavour to make the learning of English an enjoyable and rewarding experience for pypils. Through these books we hope that children will embark on a pleasurable journey in a land where they encounter a variety of delightful learning experiences which enable them to become confident and fluent users of accurate English. The thematic organisation of the book ensures that the point from which the children start on their journey is the immediate world of school, family and friends and they are gradually led to the things and situations they are likely to encounter in the wider world as they mature

کتاب میں ترتیب دیئے گئے اسباق یقیناً فکر انگیز ہیں، لیکن میری رائے میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ انگریزی ادبیات کے طلبہ کے لیے بھی یہ کتاب باعثِ پریشانی ثابت ہوگی۔ کتاب میں نہایت ہی دقیق الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن کے معنی و مفہوم سے دس سال کا بچہ ذہنی طور ہم آہنگی پیدا نہیں کرسکتا ہے۔ ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل یہ ایک کتاب بچوں اور اساتذہ دونوں کے لیے دردِ سر سے زیادہ دردِ جگر ہے۔ حیرانی اس بات پر ہے کہ فرینک بردرس اینڈ کمپنی اور آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے چھپی =/184 روپے کی یہ کتاب بچوں کی نفسیات، صحت، اور صبح وشام کے سکون پر کیا اثرات مرتب کرے گی۔ وہ سمجھنے سے میں قاصر ہوں۔

اب اسی کلاس کی اُردو کتاب ''تعمیرِ اردو'' کا معیار، اسلوبِ بیان اور لفظیات ملاحظہ فرمایئے۔ صفحہ نمبر ۲۵ پر ''چنار'' کے عنوان سے ایک عمدہ سبق تحریر کیا گیا ہے، لیکن مضمون میں چوتھی جماعت کے بچے میری رائے میں اس قسم کے جملے اور لفظیات سمجھنے سے عاجز بھی اور قاصر بھی رہیں گے۔ مثلاً

''چنار کا درخت ایسا لگتا ہے، گویا آگ کی مِشعل کھڑی ہو، طلادوزی، کندہ کاری، چلچلاتی دھوپ، تعمیرات، شیدائی، علامت، گھنے سایے، مبلّغ، مصلح، فروغ، مُحسن، سیّاح، شعبہ جات، دفاتر،

صفحہ ۵۰ پر یہ ''مکالمہ پڑھیئے'' درج ہے۔

احسن (حسن سے) حسن بھائی۔ ذرا اس لفظ کا مطلب تو سمجھایئے۔

حسن: کون سا لفظ

احسن: ۔ کارِثواب۔ وغیرہ

کتاب کے صفحہ نمبر ۷۴ پر چوتھی جماعت کے بچوں کو ان لفظوں سے شناسا کرنا کہیں زیادتی تو نہیں ہے؟
سبکتگین، ٹمٹکی، ڈبڈباتی، کلیلیں، بادشاہت، مخلوق"۔ موضوعاتِ کتاب واقعی بصیرت افروز ہیں، لیکن ترتیب کار کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ یونیورسٹیوں میں زیرِ تعلیم اردو کے طلبا کو اس قسم کے الفاظ تحریر کرنے اور ایسے محاورے اور ضربُ الامثال استعمال کرنے میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چہ جائیکہ کہ تیسری یا چوتھی جماعت کے بچوں سے ان بھاری بھر کم لفظوں کو سمجھنا اور پھر ان کے جملے بنانا- ایں خیال است و محال است و جنوں۔

پرائمری اور ثانوی سطح پر طالبین اور طالبات کے لیے ایسا نصاب ترتیب دیا جانا چاہیے، جو ہر اعتبار سے متوازن، آسان، سہل الفہم اور طلبہ کی دلچسپی بڑھانے اور انہیں تعلیم کی راہوں کو آسانی سے طے کرنے کا ذریعہ بننا چاہیے نہ کہ اساتذہ اور والدین کے لیے دردِ سر۔ چند سال پہلے پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں معصوم بچوں پر بھاری نصاب مسلّط کرنے پر لمبی بحث ہوئی تھی، لیکن بحث برائے بحث ہی رہی، کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہمارے یہاں سماجی اور قومی کاز سے زیادہ سیاسی مفادات کی تکمیل اور ووٹ بینک کی تشکیل و تجدید کے لیے اہم اور نازک شعبوں کے ساتھ کھلواڑ کیا جاتا ہے۔ عمارات کے بغیر کالجوں کا قیام، فیکلٹی اور لیبارٹری کے بغیر یونیورسٹی کے مختلف کورسوں کا اعلان، ہائر اسکنڈری اسکولوں کا "نامن کلے چر" تبدیل کرنا، قریہ بہ قریہ اسکولوں کا افتتاح کرنا، آر۔ٹی۔ عارضی، کیجول اور کنٹریکچول بنیادوں پر اساتذہ کی تقرری انجام دینا کہاں کا انصاف ہے؟ محکمۂ تعلیم جیسے حساس شعبۂ زندگی کے لیے انتظامیہ میں کسی بھی صاحب یا صاحبہ کو بحیثیت نگرانِ اعلیٰ مقرر کرنا سیاست دانوں کی پسند و ناپسند کا ایک معمول کا عمل بن چکا ہے۔ ہمارے انتظامیہ میں اعلیٰ

صلاحیتوں کے منتظم موجود ہیں، اور یہ ریاست کی تعلیم اور تہذیب سے وابستہ ایک بڑے طبقے کی رائے ہے کہ شعبہ تعلیم ایسے لوگوں کی نگرانی میں رہنا چاہیے جو قومی تعلیمی کمیشنوں، کمیٹیوں، تربیتی اداروں اور امتحانی طور طریقوں، رپورٹوں اور سفارشات سے بخوبی آگاہ ہوں، تب جا کے تعلیمی پالیسی، اور تدریسی نظام میں بہتری پیدا ہوسکتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ہزاروں اساتذہ تعلیم کو ایک مقدس مشن جان کر اور اسے اپنا قومی وقار سمجھ کر ہی ایک بااثر اور دوررس تعلیمی نظام کو تخلیق کر سکتے ہیں۔ آج یہ شعبہ معمارانِ قوم کی عدم دلچسپی، سردمہری، اور اور بے بضاعتی کے سبب روز بہ روز زوال پذیر ہوتا جارہا ہے۔ یہ شعبہ اپنا تقدس، اپنی توقیر اور اپنے اندر موجود لطیف قدروں سے محروم ہورہا ہے اور یہ دولت کمانے کی سب سے بڑی انڈسٹری میں بدلتا دکھائی دے رہا ہے۔ باہر سے درجنوں جعلی اسناد لے کر لوگ وادی میں وارد ہورہے ہیں۔ چنانچہ چند دن پہلے ایک صاحب باہر کی ایک یونیورسٹی سے ایم فل میں فرسٹ ڈیوژن سرٹیفکیٹ لے کر میرے پاس آئے اور بیک وقت پی۔ ایچ۔ ڈی اور ملازمت میں دستِ تعاون دینے کی گذارش کرتے رہے۔ میں نے ایم۔ فل کے موضوع، مقالے اور دیگر امور کے بارے میں پوچھا تو اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہمارے پورے نظام کو جعلسازی اور بددیانتی نے مکمل طور پر اپنے گھیرے میں لے لیا ہے، لیکن شعبہ تعلیم کا دغل وفریب کی لپیٹ میں آنا ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے۔ مضمون کے کالم کی تنگ دامانی حائل ہے ورنہ درجنوں مثالوں سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم کے مراکز تک کن افسوسناک اقدامات اور فیصلہ جات نے نظامِ تعلیم کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ مخلص اور محنتی اساتذہ کی زبانوں پر تالے چڑھ چکے ہیں۔ ہوشیار اور ذہین بچوں کا ناطقہ گنگ ہوکر رہ گیا ہے، ماہرینِ تعلیم و تحقیق خاموشی سے گرتے اور بگڑتے معیار کو دیکھ رہے ہیں۔ ہر گورنمنٹ اسکول کے

ایک بچے پر انسانی وسائل کی ترقی کی وزارت ماہانہ =/1586 روپے واگذار کرتی ہے۔ مڈ ڈے میلز، کتابوں کی مفت فراہمی، گرانٹس اور وظائف کی دستیابی اور متعدد اسکیموں کے تحت بے اندازہ رقومات کی واگذاری کے باوجود اسکولوں میں امتحانی نتائج کی شرحِ فیصد' قابل تبصرہ بھی ہے اور لائقِ تجزیہ بھی۔

ریاستی حکومت کے ذمہ داروں سے یہ ہماری مخلصانہ استدعا ہوگی کہ زراعت' باغبانی' جنگلات' تعمیرات اور افزائشِ حیوانات کے محکمہ جات میں آپ کے فیصلے اور منصوبے کیا ہوں گے' وہاں ترقی اور تعمیر کے نام پر کیا گُل کھلیں گے' لیکن شعبۂ تعلیم اور نظامِ تدریس کو صحت مند بنیادوں پر قائم رکھنے' اسکی ہمہ گیر ترقی کو یقینی بنانے' اساتذہ اور طلبہ کو جواب دہ بنانے' رقومات کے برمحل استعمال کی راہوں کو کشادگی فراہم کرنے اور اسے جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اساتذہ کی ترقیوں کے مواقع آسان بنادیئے جائیں' انکی تنخواہوں میں تفاوت کو دور کیا جائے' اسکولوں میں بہتر سہولیات میسّر رکھی جائیں۔ پرائیوٹ اِسکولوں کی کارکردگی گذشتہ بیس برسوں میں تعلیم و تدریس کے حوالے سے بہتر رہی کیونکہ وہاں اساتذہ جواب دہی کے عمل سے گذرتے ہیں۔ لیکن ایک اہم انسانی مسئلے کی طرف پرائیوٹ اسکولوں' پرائیوٹ کالجوں اور پرائیوٹ تکنیکی اداروں کے سربراہوں اور منتظمین کی توجہ مبذول کرنا ناگزیر محسوس ہوتا ہے کہ ان اداروں میں کام کرنے والے بے روزگار' بے کس اور غربت و افلاس کے مارے جوان لڑکوں اور لڑکیوں کا استحصال نہ کیا جائے۔ حالات کی ستم ظریفی کے مارے ہوئے ان لوگوں کو پرائیوٹ اسکولوں میں گورنمنٹ تعلیمی اداروں کے اساتذہ کے برابر تنخواہیں ملنی چاہیں کیونکہ پرائیوٹ سیکٹر کے ادارے والدین سے کروڑوں اور اربوں میں فیس اور دیگر شقوں کے تحت رقومات وصول کرتے ہیں۔ یہی حقیقی تعلیم' انسانیت اور مروت کا تقاضہ

ہے۔ ہماری قوم کے لیے ترقی اور شاندار مستقبل کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے ہمہ پہلو نظام تعلیم۔

☆☆☆

ڈگری کالج اسلام آباد
جنوبی کشمیر کا اولین تعلیمی سرچشمہ

ڈگری کالج اننت ناگ (اسلام آباد) کے جشنِ زرّین تقریبات کے موقع پر چند تاثرات قلمبند کرتے ہوئے مجھے بے اندازہ مسرت ہو رہی ہے اور کالج سے وابستہ میٹھی یادوں کا ایک طویل سلسلہ لوحِ ذہن پر تازہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں میرا داخلہ کالج میں ہوا، زندگی کا ایک نیا نرالہ باب کھل گیا۔ کالج میں مخلوط نظامِ تعلیم تھا۔ تدریسی اور تعلیمی سرگرمیوں کے بغیر کالج کا اس زمانے میں کوئی اور تصور ہی نہیں تھا۔ مجھے کالج لائف کا پہلا واقعہ یاد آرہا ہے کہ سرمائی تعطیلات شروع ہونے سے پندرہ دن پہلے ۲۹ نومبر ۱۹۷۲ء کو ایک محفلِ مباحثہ کا انعقاد ہوا۔ مباحثے کا عنوان تھا:

"Science has done more harm to humanity than good".

اس مباحثے کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ عنوان کا اعلان دس منٹ پہلے کالج کے پرنسپل جناب پیرزادہ علی محمد صاحب نے کیا۔ بیس پچیس مقررین نے دھواں دار تقریریں کیں، لیکن خوش نصیبی سے میری تقریر بہترین قرار دی گئی، اور میری عزت افزائی ایک آکسفورڈ انگلش ڈکشنری اور نقد انعام سے کی گئی۔ شام کو ریڈیو کشمیر کے کشمیری اور اُردو خبروں کے بلیٹن میں میرا ذکر کیا گیا، جس سے میری زبردست حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس دن سے لیکر گریجویشن مکمل ہونے تک کالج کے تمام مباحثوں، مذاکروں اوادبی سرگرمیوں میں میرا بڑھ چڑھ کر حصہ رہا۔

اگلے سال کالج میگزین ''ویری ناگ'' کی ادارت کی ذمہ داری جنابِ شوریدہ کاشمیری مرحوم نے میرے اوپر ڈال دی۔ مجھے تقریر اور تحریر دونوں میں حوصلہ، ہمت، پذیرائی اور داد و تحسین کے اولین مواقع کالج کے چناروں کے سایوں میں حاصل ہوتے رہے، اور اب جب کبھی کالج سے گذرتا ہوں، تو اس کے دیواروں، چناروں، پارکوں اور سبزہ زاروں کی طرف حسین یادوں کے ساتھ نظریں ملاتا ہوں اور ایک عجیب ذہنی کیفیت میں کھو جاتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس زمانے میں کالج میں تعینات پروفیسر حضرات اپنی کلاس بڑی باقاعدگی سے لیا کرتے تھے۔ پرنسپل صاحب دن میں کئی بار مختلف شعبوں کے اردگرد، کبھی ایک بہانے اور کبھی دوسرے بہانے چکر کاٹ کر تدریسی عمل کی انجام دہی کی کڑی نگرانی کیا کرتے تھے، کالج کے ہر شعبے میں معروف و مقبول اساتذہ، جنکی شہرت ریاست گیر تھی، اپنا تدریسی فریضہ خوش اسلوبی، دیانت داری اور انتہائی فرض شناسی کے جذبے کے تحت ادا کرتے تھے۔ شاید ہی کوئی استاد کلاس روم میں جانے سے جی للچاتا تھا اور خال ہی کوئی لڑکا کلاس سے باہر آوارہ دکھائی دے سکتا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اساتذہ تعلیم و تعلّم میں ایمان داری اور فرض شناسی کو عبادت تصور کرتے تھے اور نمازِ جمعہ کے فوراً بعد بھی ہماری کلاسز ہوا کرتی تھیں۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں، جب میں کالج میں زیرِ تعلیم تھا، معتبر اور معروف اساتذہ کی کہکشاں میں پروفیسر لئیق احمد قریشی، پروفیسر شوریدہ کاشمیری، پروفیس مولوی محمد ابراہیم، پروفیسر محمد عبداللہ پنو، پروفیسر روپ کشن ایما، پروفیسر ایم۔ این تکو، پروفیسر عبدالغنی میر، پروفیسر محمد عبداللہ شیداؔ، ڈاکٹر ڈی۔ این درانی، پروفیسر غلام محمد شادؔ، پروفیسر ستار احمد شاہد، پروفیسر عبدالغنی شاہ، پروفیسر وحید الزماں دیوا، پروفیسر حمید اللہ خان، پروفیسر غلام رسول شاہ، اور پروفیسر غلام نبی نثار اور پروفیسر عبدالغنی شاہ چند ایسے مکرم محترم نام ہیں، جن کے سامنے

طلبہ کی مکمل ذہنی ،فکری ،علمی ،اور ادبی رہنمائی اور سر پرستی مقدم تھی اور الاونس ،انکریمنٹ یا دیگر مالی مراعات ثانوی حیثیت رکھتی تھیں ۔اس بے لوث تربیت اور توجہ میں انہیں زندگی کا مزہ آتا تھا،عبادت کا احساس ہوتا تھا اور ان کا ضمیر مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ایک بار ایک با اثر پروفیسر کی گھریلو مصروفیات کے سبب انکی کلاس ایک دو دن تک مُعطّل رہی۔ میں عینی گواہ ہوں کہ پیرزادہ صاحب نے ایسی کھری کھری انہیں سنائی ،کہ وہ شرمندگی سے زمین بوس ہو گیا،اور آئندہ بڑے احتیاط سے کام لیتا رہا۔

طلبہ اور اساتذہ کا باہم دگر گہرا رشتہ تھا۔احترام کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ کو دیکھ کر تلامذہ حواس باختہ ہو جاتے تھے۔کلاس میں استاد کے چہرے پر ذرا سا خشم دیکھ کر پوری کلاس دم فروبستہ ہوتی تھی۔استاد کے منہ سے جو بات نکلتی تھی وہ طالبِ علم کے دل و دماغ پر نقش ہوا کرتی تھی۔ فارسی کے مشہور شاعر نظیری نے استاد کا مقام اور اسکی حیثیت متعین کرتے ہوئے عمدہ بات کہی ہے کہ اگر استاد کا درس یا طریقۂ تدریس محبت و شفقت کا زمزمہ ہوگا تو جمعہ یعنی سکول میں تعطیل کے دن بھی بھگوڑا شاگرد سکول آتا رہے گا۔

درسِ ادیب اگر بود زمزمہ محبتے

جمعہ بہ مکتب آورد طفلِ گریز پاے را

میرا خیال ہے کہ جن دنوں میں ڈگری کالج میں زیرِ تعلیم تھا،اس زمانے میں تعلیم و تدریس کے پیچھے ایک مشینری جذبہ کارفرما تھا۔ذہنی و اخلاقی تربیت کا احساس غالب اور سیکھنے سکھلانے کا شوق موجزن تھا۔اساتذہ کے لئے تعلیم و تدریس صرف پیشہ یا ذریعۂ معاش نہیں بلکہ آلِ احمد سرور کے الفاظ میں ''کاروبارِ شوق'' تھا۔آج جدید زمانے کی تمام ترسہولتیں کالجوں میں دستیاب ہیں ،لیکن اخلاص ،ایثار ،اور احساس کا شدت سے فقدان ہے۔ کالج میں

مذاکرے، مباحثے مشاعرے اور جسمانی کھیلوں کے مقابلے بڑے باضابطگی کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ اور سربراہِ ادارہ سرینگر کا باشندہ ہونے کے باوجود کالج کے بالکل متصل رہائش پذیر تھا۔ پیرزادہ صاحب سے پہلے بھی کالج کی سربراہی بڑے باصلاحیت منتظموں نے کی لیکن پیرزادہ صاحب ایک صاحبِ نظر، مخلص، مشفق اور مردم شناس شخصیت کے مالک تھے۔ کسی طالب علم میں کوئی غیر معمولی صلاحیت، اہلیت اور لیاقت پاتے تو اسکی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے تھے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کالج کے مباحثوں میں میری اچھی کارکردگی اور پھر سیکنڈ ائر کے سالانہ امتحان میں امتحانی مرکز کے معائینہ کے دوران میرا خوش خط دیکھ کر ایک دن مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔ چپراسی سے کہا کہ اکاؤنٹنٹ محمد رمضان کو بلائے، اکاؤنٹنٹ فوراً حاضر ہو گیا، مختلف وظائف کے بارے میں اس سے استفسار کیا۔ اس نے وظائف کی پوزیشن واضح کر دی۔ چنانچہ دو سو روپے کا ایک وظیفہ میری حق میں واگذار گیا، جو چند ماہ تک ملتا رہا۔

کالج ایام کے دوران طلبہ کا ایک گروہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں دلچسپی لے کر کبھی کبھار پولیس کے ساتھ تصادم اور ٹکراؤ مول کر کالج کی تعلیمی فضا کو متاثر کر دیتا تھا، جوانی کا طنطنہ تھا، فہم ادراک میں پختگی کی کمی تھی کہ غیر شعوری طور ایک ہنگامے میں میرا بھی کچھ حصہ رہا کہ کالج کے بارہ طالبِ علموں کو پولیس گرفتار کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وٹالی صاحب ایس۔ پی انت ناگ تھے۔ بڑے سخت گیر آفیسر تھے۔ پیرزادہ صاحب نے میری حراست کے بارے میں جب تو سنا، وٹالی صاحب سے ملے۔ مجھے ایک جیپ میں پولیس لائنز سے انکی رہائش گاہ پر لے جایا گیا، وہاں پیرزادہ صاحب اور وٹالی صاحب نے علامہ اقبالؒ کے فکرو فن پر مجھ سے کچھ سوالات کیئے، جواب صحیح نکلا تو مجھے اسی وقت رہا کیا گیا۔ پچیس سال بعد

وٹالی صاحب اس سلیکشن کمیٹی کے پی۔ ایس۔ سی کے ناطے ممبر تھے، جس میں میرا یونیورسٹی کے لئے انتخاب ہوا۔ یہ انٹرویو دلی میں ہوا اور وٹالی صاحب نے وہ واقعہ مجھے یاد دلایا، جو پچیس سال پہلے پیش آیا تھا۔

طالب علمی کے زمانے میں کالج میں میرا خاص تعلق پروفیسر شوریدہ کاشمیریؔ مرحوم کے ساتھ رہا۔ وہ اپنی لاأبالی طبیعت کے باوجود میری طرف خاصہ دھیان دیتے تھے۔ یہ تعلق انکی زندگی کے آخری لمحات تک رہا۔ میں نے اپنے اس مکرم استاد کی شاگردی کا حق بعد میں یوں ادا کیا کہ کشمیر میں اقبال اکیڈمی کا سنگِ بنیاد ڈال کر شوریدؔہ صاحب کو اس کا صدر مقرر کروایا، جس کے حقیقی معنوں میں وہ حقدار تھے، شوریدہ صاحب کی وفات کے فوراً بعد ۲۱ اپریل ۱۹۹۱ء کو نئی بستی اسلام آباد میں انکی ادبی زندگی پر ایک شاندار اجلاس کا انعقاد کرایا۔ ان پر توصیفی، ادبی، عقیدتی اور دیگر نوعیت کے چھوٹے مضامین جمع کرا کے شوپیان ڈگری کالج کے احاطے میں ''بیادِ شوریدؔہ کاشمیری'' کے عنوان سے ایک کتاب اجراً کی اور اس گم صُم قسم کے پختہ فکر شاعر کے تئیں معمولی سا نذرانۂ محبت پیش کیا۔

ڈگری کالج اسلام آباد میں جن اساتذہ کرام کے سامنے مجھے تلمذ کا موقع ملا ہے ان میں اکثر اب بھی بقیدِ حیات ہیں۔ ان سے جب بھی اور جہاں کہیں بھی آمنا سامنا ہوتا ہے، میرا دل ان کی نسبت ادب و احترام کے جذبات سے بھرپور ہوتا ہے، اور انکی ہر بات کو دل و جان سے تسلیم کرنے میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

موجودہ نظامِ تعلیم کا موازنہ اور مقابلہ جب ہم اس عہد کے نظامِ تعلیم و تدریس سے کرتے ہیں تو ایک بڑا فرق جو محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کالج میں وہ سہولیات اور مراعات میسر نہیں تھیں۔ فوٹوسٹیٹ کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ریفریشر کورسز، آرینٹیشن کورسز اور اس

قبیل کے تصورات سرے سے موجود ہی نہیں تھے، اور نہ اساتذہ کو اتنی موٹی تنخواہیں ملتی تھیں، جو آجکل دی جاتی ہیں، لیکن جو واضح فرق نظر آتا ہے کہ اس زمانے میں تعلیم و تدریس کے پسِ منظر میں ایک مشن کارفرما تھا۔ آج تعلیم و تدریس ایک تجارت، پیسہ بٹورنے اور دولت اینٹھنے کا ذریعہ ہے۔ یقیناً کالجوں میں آج بھی باضمیر، فرض شناس اور ذہین اساتذہ کی کمی نہیں، لیکن تجارتی طرزِ تعلیم و تدریس نے انہیں بے بس بنا کر رکھ دیا ہے۔ بقولِ اقبالؒ ؎

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

ڈگری کالج اسلام آباد جنوبی کشمیر کا پہلا تعلیمی، تہذیبی اور تمدنی گہوارہ ہے اور ہماری تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے جس کو نصف صدی سے بہترین اساتذہ نے اپنا خونِ جگر دے کر کافی محنت و مشقت سے شہرت عام اور بقائے دوام کی منزل تک پہنچایا ہے اور اس کالج کے فارغ التحصیل طلبہ میں درجنوں انتظامی، تعلیمی، قانونی، تجارتی اور سیاسی شعبہ ہائے حیات میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ طلبہ کی فہرست لمبی ہے اور مضمون کی تنگ دامانی مانع ہے کہ ان سب کا نام لیا جائے۔ بہرکیف اس قدیم الایام مادر علمی کے تعلیمی معیار کو بڑھاوا دینے، اسکی تجربہ گاہوں میں توسیع کرنے اس کی لائبریری کو جدید سہولتوں سے آراستہ کرنے اور کالج میں ادبی ثقافتی، تمدنی اور تہذیبی سرگرمیوں کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری اس کالج سے وابستہ تمام افراد و ارکان پر عائد ہوتی ہے۔

؎ ہر لحظ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے قافلۂ شوق نہ ہو طے

''خیرِ عام'' کی ضرورت و معنویت

مذاہبِ عالم کے قابلِ احترام رہنماؤں کے اقوال، اِرشادات اور ملفوظات ہر زمانے میں اخلاقی قدروں اور انسانی اخوّت و محبت کی راہوں پر گامزن ہونے کی تمنا کرنے والوں کے لیے ہدایت و رہنمائی اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوتے رہیں گے۔ انبیاً کرام کے فرمودات و تعلیمات کا مرکزی نُقطہ انسان کو حقیقی انسان بنانا اور اسکی زندگی میں صالح، خوشگوار، متوازن اور خدا پرستی کی قدروں پر مبنی ایک انقلاب برپا کرنا تھا اور یہ کام اللہ کے ان پاکباز بندوں نے تا دمِ واپسیں پوری ثابت قدمی کے ساتھ انجام دیا۔ شہرۂ آفاق شخصیتوں کی کہکشاں میں ''خُلقِ عظیم'' کے حامل اور دنیا و عُقبیٰ کی زندگی میں توازن و تناسب کا نظریہ پیش کرنے والی سب سے قابلِ قدر شخصیت جنابِ رسول اکرمؐ کی ذاتِ اقدس ہے۔ جو بظاہر ایک اُمّی تھے، لیکن اس اُمّی صفتؐ پر جب آسمانی علوم کے دروازے کھول دیئے گئے اور ان کی ہر بات کو وحی کے مطابق قرار دیا گیا، تو دنیا نے دیکھ لیا، کہ اس عظیم پیکر انسانیؐ نے ایسے الفاظ، ایسے کلمات اور ایسے نکات دنیا کے سامنے پیش کیے کہ مغرب کے ایک، ہزار اسکالروں جنہیں مستشرقین (orientalists) کہتے ہیں، اور جن میں سے اکثریت کا فلسفہ اور اپروچ اسلام کی امیج بگاڑنے پر ہی منحصر ہے وہ بھی جب ذاتِ اقدسؐ کا ذکر کرتے ہیں تو چارو ناچار انہیں آپ کی صداقت کے اعلیٰ اصولوں کو سراہنا پڑتا ہے۔ یہ اُصول، یہ اقدار، یہ ارشادات اور تعلیمات کیا ہیں انسان کو ایک معبودِ حقیقی کی اطاعت پر راضی کرنا، زندگی اس کے بتائے ہوئے

احکام کے مطابق بسر کرنا اور صالح قدروں کو عام کرنے میں اپنا وقت استعمال کرنا ہے۔
آپ نے اپنی ترسٹھ سالہ حیاتِ مبارکہ میں انسانی زندگی کے لیے ایسے سنہرے نقوش اور لافانی اصول مرتب کیے جن اصولوں کی بنیاد حق وصداقت، خیر خواہی، سادگی، بے نیازی، جذبۂ قربانی، بندگانِ خدا سے بلا امتیاز رنگ ونسل، محبت، مروت اور شفقت کے مزاج ومعیار پر قائم ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی تعلیمات میں حُسنِ اخلاق، صبر، شکر، حیا، غیرت، دیانت، پاسِ عہد، سخاوت، خیرات وصدقات، رحمدلی، نرمی، خاکساری، قناعت، فقر واستغنا، میانہ روی، بردباری، خود شناسی، اور اسی قبیل کی متعدد خوبیوں اور صفتوں کو زبردست اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں وہ عظیم فلسفہ کارفرما ہے کہ پیغمبر رحمتؐ ایک قبرستان سے گذر رہے ہیں کہ ایک قبر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا، کہ یہ جنتی ہے۔ آپؐ سے عرض کیا گیا کہ اس قبر والے کے جنتی ہونے کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا ایک بار پیاسے کتے کو پانی پلایا، یہ ادا خدا کو بہت پسند آگئی''۔
دراصل بات یہ ہے کہ معاشرے میں بھلائی، صلاح وفلاح، خیر عام، خدمت، ہمدردی اور ایثار ہی وہ سنہرے اصول ہیں، جن کے رشتے ناتے کائنات کے بنانے والے کے فلسفہ تخلیق کے بنیادی امور سے جا ملتے ہیں۔ مادہ پرستی، شکم پروری، خود غرضی اور خود بینی کی آج کی دنیا کو ایک بار پھر انہی اخلاقی، روحانی، الہامی، اور انسانی اصولوں پر کاربند رہنے سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ معاشرے کے پریشان حال، پراگندہ، مایوس اور بے سہارا افراد کو ان صحت منداور عدلِ اجتماعی پر مبنی ارشادات سے راحت وطمانیت اور انکی محرومیت کو امید ورجا کا سامان مہیا ہوسکتا ہے۔ کیوں نہ ہم اپنی صلاحیتوں اور مال ودولت کو ان لوگوں کے لیے وقف کردیں، جو ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں۔

ے خیرے کن اے فلاں و غنیمت شمار عمر
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند
(سعدیؔ)

مفہوم :۔ اے انسان نیکی کر اور زندگی کو غنیمت جان اس سے پہلے کہ دنیا سے تیرے چلے جانے کا اعلان ہو جائے گا۔

اِنسان دوستی

اللہ تعالیٰ کی جُملہ مخلوقات میں انسان اپنی سرِشت کے اعتبار سے قرآن کے الفاظ میں ''احسن'' قرار پایا ہے۔ یعنی بہت ہی اچھا اور بڑی عزت اور متانت والا۔ انسان کا یہ پانچ حروف کے ملاپ سے بنا ہوا لفظ دراصل ''اُنس'' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں محبت' پیار' ہمدردی' اور شفقت۔ ان اَجزا کو ملا کے انسان کا وجود متشکّل ہوتا ہے۔ خدا کے بندوں سے محبت وشفقت' قربانی و ہمدردی' ایثار و اِنفاق اور جذبۂ رحم: ب کھل کر سامنے آئے تو سمجھیئے کہ انسان اپنی اصل شکل وصورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ حضرت رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بزرگ دن کے اجالے میں چراغ لے کے ایک شہر کے اردگرد گھومتا رہا۔ کسی نے پوچھا چراغ لے کے کیوں نکلے ہو' کہا ''میں انسان کی تلاش میں ہوں'' یہ جو بظاہر ''انسان دکھائی دے رہے ہیں'' مگر اپنے افعال کے اعتبار سے درندے ہیں اور ان سے مایوسی ہوئی ہے۔ رومؔی نے مثنوی میں جو اس زمانے کے انسان کی عکاسی کی ہے آج زندہ ہوتے شاید حکایت کا انداز بالکل مختلف ہوتا۔ حقیقت میں جب تک انسان انسانیت' مروّت' محبت اور ایثار کے اوصاف سے آراستہ نہیں ہے وہ نرا حیوان ہے۔

پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سونے کے حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچے''۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا ''وہ انسان ہم میں سے نہیں' جس نے بڑوں کی عزت نہ کی اور چھوٹوں پر رحم نہ کیا''۔ انسان کی

شرافت اور خاصیت اسی وقت ظاہر ہو جاتی ہے جب وہ انسانوں کے ساتھ ساتھ دیگر مخلوقات سے بھی محبت کرتا ہے۔ ان کے دکھ سکھ میں ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ بقول اقبال،

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

انسانوں کے ساتھ دوستی، رحم لی، انصاف پسندی، محبت اور بندگانِ خدا سے بلا امتیازِ رنگ و نسل ذات اور مذہب ہمدردی و خیر خواہی وہ بڑی اور صالح قدریں ہیں جو ہر زمانے میں خدا کے نیک بندوں کی زندگی کا طرۂ امتیاز رہی ہیں۔ آدمیت کوئی ایسی اصطلاح (Term) نہیں جسے صرف زبان پر لانے سے اس کے معنی کی جہتیں مقرر ہو جاتی ہیں، بلکہ یہ ایک ایسا لفظ، ایک ایسی ترکیب اور ایک ایسی اصطلاح ہے جو عمل میں لا کے ہی واضح صورت میں سامنے آتی ہے۔ ''ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے''۔ خدا کے عیال سے محبت خدا سے محبت کرنے کے برابر ہے۔ انسان کا احترام اور اس سے حقیقی محبت تہذیب کی اصل ہے یہی ہر عہد میں خدا کے پاکباز بندوں کا شیوہ رہا ہے

بدقسمتی سے ہم لوگ ایسے زمانے میں جنم لے چکے ہیں، جس کا نہ کوئی نام ہے، نہ چہرہ بشرہ ہے، نہ ہاتھ پاؤں ہیں اور نہ کوئی پشت اور نہ پشت پا بلکہ یہ زمانہ نفسا نفسی، خود غرضی سماجی نابرابری، فسق و فجور اور ظلم و زیادتی سے عبارت ہے مجھے حافظِ شیراز کے اسرار و معارف سے بھرپور دیوان کی ایک غزل کے چند اشعار یاد آرہے ہیں جس میں انہوں نے تب کہا تھا جواب بھی صحیح ہے،

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

ہیچ نسبت ز برادر بہ برادر دارد
پسراں را ہمہ بد خواہِ پدر می بینم
اسپِ تازی شدہ مجرِوح بہ زیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

ترجمہ:۔ یہ کیا شور سنائی دے رہا ہے۔ پوری دنیا فتنہ و شر میں مبتلا ہے۔ بھائی اپنے بھائی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا ہے۔ بیٹے اپنے باپ کا برا چاہتے ہیں۔ عربی گھوڑا بوجھ تلے زخمی حالت میں ہے جبکہ گدھے کی گردن میں سونے کی مالا دیکھ رہا ہوں۔ جب گرد و پیش میں اس نوعیت کی گھمبیر صورت حال ہو انسان دوستی کے تصورات و احساسات کو عام کرنے اور اس کے ذہن اور دل آمادہ کرنے کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

☆☆☆
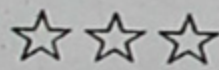
اِنکساری و فروتنی

اِنکساری ایک نیک باطن انسان کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔ مزاج میں اِنکساری، نرمی، عاجزی، فروتنی اور شگفتگی ایسی خوبیاں ہیں جو انسان کو ایک اعلیٰ اور اَرفع مقام عطا کرتی ہیں۔ نرم اور شگفتہ مزاج آدمی کے ساتھ بات کرنے میں سکون اور مسرّت محسوس ہوتی ہے۔ جبکہ تند مزاج، بدخُو، اور مُتلوِّن انسان سے ہم کلام ہونا پریشانی اور مایوسی کا سبب بن جاتا ہے۔

اپنی طبیعت میں انکساری اور عاجزی پیدا کرنے سے ہم اپنے دشمنوں اور رقیبوں کے دِل موہ لے سکتے ہیں۔ یہی طریقہ پیغمبروں، ولیوں، ریشیوں اور مُنیوں نے اپنالیا تھا۔ اسی رویّے کو اختیار کرنے سے انہوں نے کروڑوں انسانوں کے دل و دماغ میں اپنی جگہ پیدا کرلی تھی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی شخص پر اپنا کرم فرماتا ہے تو اس کے دل کو ''نرم'' اور گداز بنا دیتا ہے۔ تاریخِ انسانی کی جلیلُ القدر شخصیتوں کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوفِ خدا کے سبب اپنے آپ کو پرندوں اور چرندوں سے اَدنیٰ اور گھاس کے تنکوں سے کم تر سمجھتے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کی تربیت گاہ میں جن لوگوں نے پرورش پائی تھی انکی فروتنی اور انکساری کا یہ عالَم تھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے درخت کے سائے میں ایک چڑیا کو اُچھلتے اور پھدکتے دیکھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس سے فرمایا۔'' اے چڑیا تو کس قدر خوش نصیب ہے، درختوں کے پھل کھاتی ہے اور ٹھنڈی چھاؤں میں خوش رہتی ہے۔ پھر

موت کے بعد تو وہاں جائے گی، جہاں تجھ سے باز پُرس نہ ہوگی۔ اے کاش ابو بکرؓ بھی اس قدر خوش نصیب ہوتا''۔ آپ کبھی یہ بھی فرماتے ''اے کاش میں درخت ہوتا، کھالیا جاتا یا کاٹ دیا جاتا''، کبھی کہتے ''اے کاش! میں سبزہ ہوتا اور چوپائے مجھے چَر لیتے''۔ یہ وہی ابو بکرؓ ہیں جن کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا ''ہمارے آقاؐ کو سب سے زیادہ راحت پہنچانے والا اور ہماری سینا کا پہلا کلیم یعنی آپؐ کی رسالت کی تائید کرنے والا حضرتِ ابو بکرؓ ہی ہیں۔

آں اَمَنَّ النَّاس برمولائے ما
آں کلیمِ اوّلِ سینائے ما

جنابِ عمرؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ کسی راستہ سے گزر رہے تھے کہ کچھ خیال آیا۔ وہیں آپ زمین کی طرف جھک گئے اور ایک تنکا اٹھالیا۔ پھر ارشاد فرمایا ''اے کاش میں اس تنکے کی طرح خس و خاشاک ہوتا۔ اے کاش میں پیدا ہی نہ کیا جاتا۔ اے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی''۔ ایک بار منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ ''ایک دن وہ تھا کہ میں اپنی خالہ کی بکریاں چرایا کرتا تھا اور وہ اس کے عِوض مٹھی بھر کھجور دیا کرتی تھیں۔ آج یہ زمانہ ہے کہ امیر المومنین ہوں۔ یہ کہہ کر منبر سے اُتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا۔ ''یہ تو آپ نے اپنی تنقیص کی''۔ ''بولے تنہائی میں میرے دل نے کہا کہ تم امیر المومنین ہو۔ تم سے افضل کون ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ اپنی اصلیت بیان کردوں''۔ یہ تھا عاجزی و انکساری کا حال اور وہ بھی ان برگزیدہ شخصیتوں کا جن کا تقویٰ، خدا ترسی اور خوفِ آخرت مثالی حیثیت کا حامل تھا۔

زندگی کے ہر موڑ اور ہر مرحلے پر طبیعت میں انکساری عاجزی اور نرمی کامیابیوں کی سوغات لیکر آتی ہے۔ یہ طرزِ زندگی اپنے لیے اور دوسروں کے لیے طمانیت، قربت اور محبت کا بہترین ذریعہ ہے۔ سورۂ لقمان میں کیا ہی خوبصورت ارشادات بیان کئے گئے ہیں، جن میں

کدورت، نخوت اور خوامخواہ کی بڑائی اپنانے سے منع کیا گیا ہے

''لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمیں میں اکڑ کر چل اللہ کسی خود پسند اور بڑائی جتلانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔ اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز ذرا پست رکھ، سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے''۔

☆☆☆

احساسِ ذمہ داری

قانونِ قدرت کے مطابق ہر جاندار مخلوق کے یہاں ذمہ داری کا ایک احساس شعوری اور غیر شعوری طور پر کارفرما ہے۔ گھر، دفتر، کارخانہ، بازار، دکان اور کھیت کھلیان میں اپنا کام خوش اسلوبی، فرض شناسی اور دیانت داری کے جذبے کے ساتھ انجام دینا ذمہ داری کے احساس کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی جن قوموں کے یہاں احساس، حسیّت اور محسوسات کے جملہ محاسن مثبت انداز میں عملی شکل وصورت میں ظہور پذیر ہیں، فطرت نے ان قوموں کی پشت پناہی اور عزت افزائی میں کوئی بخل روا نہیں رکھی۔ رنگ، مذہب، زبان اور جغرافیہ کا کوئی امتیاز ان کی ترقی کی راہ نہ روک سکا۔ شفاخانے میں ایک ڈاکٹر، ایک نرس اور ایک تیماردار کی ذمہ داری کا احساس ایک بیمار کے لیے شفایابی کا ذریعہ بن جاتا ہے اور یہی احساس اگر وہاں مفقود ہے، تو پھر بیمار کا دار الشفا سے بسلامت گھر لوٹنا ''خیال است محال است وجنوں'' کے مصداق ہے۔ اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں استاد کا احساسِ ذمہ داری آدم گری (Man-making) کا موجب بن جاتا ہے۔ اگلے وقتوں میں یہ احساس اپنے اندر اِخلاصِ عمل رکھتا تھا، آج وہ خلوص عنقا ہے۔ روشنی کے یہ ادارے اب تجارتی مرکزوں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور ذمہ داری کا احساس آئے دن ماند پڑتا جارہا ہے۔ یورپ میں مقیم ایک کشمیری ڈاکٹر نے راقم سے ایک ملاقات میں وہاں کے لوگوں کی زندگی کے سینکڑوں نقائص اور معائب کی نشاندہی کی لیکن دو خوبیوں کی موجودگی کا نہ صرف اعتراف کیا، بلکہ ان پر سختی سے عمل کرنے کی ضرورت بھی واضح کی۔ ایک خوبی کہ وہ ہر حال میں سچ بولتے ہیں اور دوسری یہ کہ ذمہ داری کا احساس بدرجۂ اَتم

ان کے یہاں موجود ہے۔ مجھے دانائے راز یاد آ گئے، جنہوں نے ایک فارسی رباعی میں مسئلۂ تقدیر کے ایک پہلو کی طرف بہت ہی عمدہ اشارہ کیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ ''خدا نے اس قوم کے حق میں سرداری اور بالادستی مقرر کر دی ہے جو قوم اپنی تقدیر اپنے ہاتھ سے تحریر کرتی ہے۔ اس قوم کے ساتھ خدا کا کوئی تعلق نہیں جس قوم کے دہقان دوسروں کے لیے فصل اگاتے ہوں''۔ دراصل محنت، ریاضت اور ذمہ داری کا احساس ہی وہ عناصر ہیں، جو انسان کی خارجی تقدیر کے عناصر و عوامل کو ایک عملی شکل فراہم کرتے ہیں ہمارے یہاں فرد سے لیکر جماعت تک ہر ایک کا مزاج ایک ایسے افسوسناک ارتقائی عمل سے گذر رہا ہے جہاں تبدیلی، اصلاح اور تعمیر کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ معاشرے کے مجموعی نظام کا تار و پود اس قدر بکھر چکا ہے کہ کوئی سنجیدگی اور فرض شناسی کے تحت کام کرنے کے لیے تیار نہیں۔ استثنیٰ ضرور موجود ہے، لیکن اجتماعی عدم احساس نے مایوسی کی سی حالت پیدا کر دی ہے۔ بقول ایک یو پی پاور انجینئر کے جو شہرِ خاص کے اندرونی علاقوں کا کئی سال پہلے تجزیہ کر رہا کر رہا تھا کہ ''کشمیر کا بجلی نظام خدا کے فضل و کرم کا کرشمہ ہے کہ گنجان علاقوں میں گیارہ ہزار واٹ ترسیلی لائن کے دوش بدوش سروس لائن بھی چالو ہے''۔ ذمہ داری اور انتظامی سنجیدگی کے اسی عدم احساس کے سبب بے شمار لوگ کرنٹ لگنے سے یا تو جاں بحق ہو گئے یا عمر بھر کے لیے ناکارہ۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ سوسائٹی کا ہر فرد اپنی اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے نظامِ تمدُّن میں اپنا حصہ ادا کرے ورنہ آوارہ جانوروں، چوپایوں، وحشی درندوں اور انسان کے درمیان بظاہر کوئی فرق نہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق حیوانات میں بھی ذمہ داری کا ایک غیر محسوس عنصر کافی حد تک موجود ہے۔

صدقِ مقال - ابدی حقیقت

صداقت یا صدقِ مقال وہ عالمگیر اصول ہے جس نے ہر عہد میں کامیابی پائی ہے۔ حق پرستوں اور سچائی کے علمبرداروں کو وقتی طور پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے مگر سچا آدمی سات بار گرتا ہے اور پھر اٹھتا ہے۔ مُفکّرین کے نزدیک خدا اگر نور کا ایک عظیم پیکر ہے، لیکن اصل میں صداقت کا دوسرا نام ہی خدا ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنی خواہش پر قابو حاصل کرے اور وہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ قول و فعل، گفتار و کردار اور ارادہ و عمل میں وہ نیک اور سچّا ہو۔ جس شخص کا معاملہ سچائی کی بنیاد پر قائم ہے وہ گویا نہایت عمدہ اسلحہ سے آراستہ ہے لیکن اس کے راستے میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔ سچائی کا راستہ اپنا نا خطرات سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ دنیا والوں کی اکثریت اس کائناتی حقیقت کے مطابق اپنے آپکو ڈھالنے کے لیے تیار نہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ وسلم نے سچائی کے ابدی اصول اپنی قوم کے سامنے پیش کیے تو پوری قوم سوائے چند روشن ضمیر اشخاص کے آپ کے خلاف سراپا بغاوت ہوگئی۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ صداقت کے اس عظیم داعیؑ نے مکہ مکرمہ کو خیر باد کہا، مشکلات برداشت کیے، طائف کے بازار میں زخمی ہونا پسند کیا، تمام قسم کی مخالفتوں کا سامنا کیا اور آخر کار حق و صداقت سرفراز ہوئی اور آپ دوبارہ فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوئے

آپؐ سچائی پر ثابت قدم رہے اور فرمایا کرتے تھے۔ ''اگر تم میرے ہاتھوں پر چاند اور سورج بھی لاکر رکھ دو، تو پھر بھی میں سچائی کا راستہ نہیں چھوڑوں گا''۔ یہ صرف تئیس سال کا

مختصر زمانہ تھا کہ آپؐ نے ایک وحشی، خانہ بدوش اور جہالت میں ڈوبی ہوئی قوم کو صدق و صفا اور تسلیم و رضا کا نمونہ بنا دیا۔ آپؐ کی پوری جد و جہد سچائی کی اساس پر قائم تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر پختہ اور لافانی یقین بھی تھا۔ حدیث میں آیا ہے کہ ''سچائی نیکی کی طرف لے جاتی ہے''۔ یہ بھی فرمایا گیا کہ ''تم میں اس شخص کا خواب زیادہ سچا ہے جسکی بات زیادہ سچی ہے''۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

انسان کا جسم نہانے سے صاف رہتا ہے اور دل صدقِ مقال سے۔ سچائی کو ہر حال میں جو لوگ اپنا شعار بناتے ہیں، عزت شہرت اور قبولیت از خود ان کے پاس آجاتی ہے۔ حضرت جلال الدین رومیؒ نے تب کہا تھا اور آنے والا زمانہ اسکی تائید کرے گا کہ ''دین کا راز دو باتوں میں پوشیدہ ہے۔ صِدقِ مَقال اور اَکلِ حلال''، یعنی سچی بات کہنا اور حلال رزق تلاش کرنا۔ یہ دو خوبیاں جس آدمی میں بھی موجود ہوں یا جو ان دو باتوں کی طرف ہمیشہ کوشاں رہتا ہے، وہ یقیناً قابل احترام ہے اور خدا کا پیارا ہے۔

دنیا کی اس عارضی زندگی میں سچائی پر گامزن رہنا، سچے اصولوں اور قاعدوں کی پابندی کرنا اور سچائی کے دامن کو تھام کے رکھنا، یہی اللہ والوں کا طریقہ رہا ہے۔ آنجہانی گاندھی جی کا ایک قول نہایت ہی وزن دار اور شاندار ہے جب وہ لکھتے ہیں ''خدا سچ ہے اور سچائی کا دوسرا نام خدا ہے''۔ سچائی پر اسی پختہ یقین نے گاندھی جی کو وہ توانائی عطا کی تھی، کہ برطانیہ کے ایک بڑے ادیب کو اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ ''موجودہ عہد میں ان سے زیادہ شریف النفس اور سچا مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا''۔ لیکن جارج برناڈ شا نے ان کی وفات پر اپنے تعزیتی بیان میں

بڑی اہم بات کہی تھی جو آج کل کے انسانی سماج پر صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ "It is too bad to be too good"
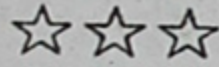
زبان کی حفاظت

قدرت نے ہرایک انسان کے منہ میں گوشت کا ایک ایسا عضو سجا رکھا ہے جسکی حفاظت سے آدمی کا پورا وجود محفوظ رہتا ہے اور اسکی شرارت ہزار پریشانیوں کا مُوجِب بن جاتی ہے۔ عربوں کے یہاں ایک ضربُ المثل ہے جَرَاحَةُ اللِّسَانِ اَشَدُّ مِنُ جَرَاحَةِ السِّنَانِ ''زبان کا زخم نیزے کے زخم سے زیادہ سخت ہوتا ہے''۔ زبان درازی سے بچنا' زبان کو قابو میں رکھنا' زبان سے دوسروں پر طنز ومزاح کے تیر تکے چلانے سے احتراز کرنا' خوش آمد اور چاپلوسی کے لیے زبان کو ہر وقت گردش میں رکھنے سے پرہیز کرنا یہی اللہ کے صالح اور روشن ضمیر بندوں کا طریقہ رہا ہے۔

زبان سے ''شکریہ'' کا ایک لفظ دوسرے کے دل و دماغ کو متاثر کر کے رکھ دیتا ہے اور اس پانچ حروف پر مشتمل لفظ کی ادائیگی میں کوئی لاگت نہیں ہے۔ مفکّرین لفظوں کی اہمیت اور زبان کے کردار کے ہمیشہ معترف رہے ہیں، اور لفظوں کے بے جا استعمال سے ہمیشہ خائف رہے ہیں آپ جنگلی جانوروں کو سُدھار سکتے ہیں اور جنگل میں لگنے والی آگ بھی تمام درخت جلنے کے بعد بجھ سکتی ہے لیکن آپ اس ظالم اور اشتعال انگیز لفظ سے لگنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتے جو آپ نے گذری ہوئی کل یا اِس صبح کو اپنی زبان کے غلط استعمال سے لگائی تھی ایسی صورت حال کا مداوا اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہم کوئی بھی بات منہ سے نکالتے ہوئے یہ سوچیں کہ اگر یہ بات مجھے کہی جاتی تو میرا ردِعمل کیا ہوتا۔ اخلاقی تعلیمات میں اسی لیے اس

بات کی تاکید کی گئی ہے کہ کسی کو ایسی بات نہ کہو جو خود تمہیں اپنے لیے پسند نہ ہو۔ اگر ہم صرف اسی بات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دوسروں کے جذبات کا خیال رکھیں تو ہمارے بہت سے نفسیاتی اور معاشرتی مسائل حل ہو جائیں گے، لیکن افسوس یہ ہے کہ جتنی فضول، بے ہنگم اور غیر محتاط گفتگو ہمارے یہاں ہوتی ہے اتنی کسی اور معاشرے میں نہیں ہوتی۔ اپنے محسنوں کے تئیں اظہارِ تشکر سعادت مندی کا ذریعہ ہے اور اس میں بخیلی ایک شخص کے دل کی تنگی اور کدورت کی عکاسی کرتی ہے۔ کسی کی جدوجہد، محنت، فعالیت اور خلوصِ عمل کو نظر انداز کر کے اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرنا درحقیقت تعصب اور تنگیٔ فکر و نظر کی غماز ہے۔ چمگادڑ کو دن کے اجالے میں کچھ نظر نہ آئے اس میں سورج کا کیا قصور ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ "جب تک زبان آپ کے قابو میں ہے تو یوں سمجھیے تلوار نیام میں ہے۔ جوں ہی آپ نے کوئی لفظ بولا یہ تلوار دوسرے کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے"۔ حضرت امام غزالیؒ نے زبان کے حوالے سے لکھا ہے "جب انسان صبح کرتا ہے تو بدن کے تمام اعضا زبان سے عرض کرتے ہیں کہ تو ہمارے معاملے میں خیال رکھنا۔ ہمارا صحیح استعمال تیرے صحیح استعمال پر موقوف ہوگا۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فرماتے تھے۔ "میں زبان سے ایک نامناسب جملہ نکالنے سے رُک جاؤں یہ میرے نزدیک ایک سال کے نفلی روزے رکھنے اور ایک مَن سونا خیرات کر دینے سے افضل ہے"۔ خداترس صوفیاً اسی لیے کم خوابی، کم خوری اور کم گفتاری پر زور دیا کرتے تھے۔ جب آدمی زیادہ بولتا رہتا ہے تو کبھی زبان مقراض کی شکل اختیار کر کے کتنے دلوں کو کاٹتی رہتی ہے۔ غیبت کا بہت بڑا جرم زبان کے بے لگام ہونے کی وجہ سے سرزد ہوتا ہے۔ اس جرمِ عظیم کے ارتکاب سے اپنی زبان کو بچایئے۔

فطرت کے مظاہر سے الفت

خالقِ فطرت نے اس دنیا کو کن کن صورتوں، رنگوں اور شکلوں میں سجایا ہے' اس کا احاطہ کرنا' اسکو لفظوں میں سمیٹنا اور اسکو زبان و بیان کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ سورج کی کرنوں میں، نسیمِ سَحر کے جھونکوں میں' چاند کی ٹھنڈی کرنوں کی روشنی میں' صبح کی صباحت اور شام کی ملاحت میں فطرت کے کیا کیا اشارے موجود ہیں۔ یہ تاروں بھرا آسمان' یہ رنگارنگ پھولوں سے مُزیّن زمین' یہ درخت' یہ سمندر' یہ پہاڑ' یہ لا تعداد جاندار اور بے جان اَشیاَ، یہ عِلَل و اَسباب کا غیر منقطَع تسلسل اور یہ تغُیر و انقلاب کا حیرت انگیز نظام قدم قدم پر انسان کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور انسان بے اختیار پکار اٹھتا ہے ''بڑی عظمت والا ہے خدا' جو بہترین پیدا کرنے والا ہے''۔

شیخ سعدی شیرازی اصلاحی اور تعمیری شعر و ادب کا ایک بہت بڑا نام ہے۔ ان کے خیال میں ''سر سبز درختوں کے پتے ہوشمند کی نظروں میں خدا کو جاننے اور پہچاننے کا ایک دفتر ہیں''۔

قرآن پاک انسان کو حقیقت تک پہنچنے کی بار بار تاکید کرتا ہے کہ وہ اس کائنات میں پھیلی ہوئی فطرت کی نشانیوں پر غور و فکر کرے تاکہ وہ صحیح نتیجہ پر پہنچنے میں کامیاب ہو۔ قرآن مجید میں سات سو بار غور و فکر کے اشارات ملتے ہیں۔ فرمایا گیا۔

''زمین اور آسمانوں کی تخلیق میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمندوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور

آسمان وزمین کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں''۔

ایک بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ تعلیم وتدریس کے فطری اُصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک فلسفی کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ منطقی طرزِ استدلال کے ذریعہ خدا کے وجود کا کھوج لگانے سے جب اُکتا گیا تو شوریدہ سر ہو کر صحرا کی جانب نکل گیا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا کو آخر حکما اور فلاسفہ ہی تو نہیں مانتے' اسکی ذات پر وہ لوگ بھی ایمان رکھتے ہیں جنہیں زندگی میں کبھی رسمی تعلیم حاصل کرنے کا موقع میسر نہیں آتا' ایسے افراد اس ذات کے وجود کے لیے کیا دلائل پیش کرتے ہونگے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسی اثنا میں اس کے پاس سے ایک گڈریا گذرا۔ فلسفی نے اسے روک لیا اور پوچھا۔'' کیا تم خُدا کو مانتے ہو''؟ گڈریے نے جواب دیا'' بے شک''، فلسفی نے دریافت کیا'' اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے''۔ اس پر گڈریے نے اپنی بد وِیانہ زبان میں کہا۔'' اونٹ کا گوبر پتہ دیتا ہے کہ یہاں سے اونٹ گذرا ہے۔ پاؤں کے نقوش راستہ چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں، صحرا میں بجھی ہوئی آگ اور ٹوٹی ہوئی طناب کسی قافلے کا اشارہ کرتی ہے، تو اب کیا یہ کشادہ راستوں والی زمین اور یہ بُرجوں والا آسمان ایک برتر و بزرگ ذات کی شہادت فراہم نہیں کرتے''۔ ایک کشادہ ذہن رکھنے والا' اور خالقِ کائنات پر یقین رکھنے والا فطرت کے چپّے چپّے اور ذرّے ذرّے میں اس ذات کے مظاہر کا مشاہدہ کرتا ہے۔ بادلوں کی گردش' بارش کے قطرے دریاؤں کی طغیانی' سبزہ زاروں کا حسن اور پہاڑوں کی بلندی اس کے دل میں فطرت سے محبت اور خالقِ فطرت سے قریب ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

زانِ دَے کوت کال گوٚس

تمٚ دینک ما خیال پیٚوس

شاہکار		تازہ		فطرتک

آبشار		ییہ		بلک		اہرہ

ترجمہ:۔خدا جانتا ہے کہ کب سے یہ آبشار بہہ رہا ہے کبھی ٹھہرنے کا خیال تو اس کے ہاں نہیں آیا۔فطرت کا تازہ دم شاہکار اہرہ بل کا یہ آبشار ہے۔

راقم السطور مہینے میں دو تین بار فطرت کے مظاہر کو نزدیک سے محسوس کرنے کے لیے کنگن، کاپرن، مانسبل، اہرہ بل، ولر کے گرد ونواح اور پہلگام کے ابرِ کوہسار، اور کبھی نور آباد کولگام کے گاؤں دیہات کے سفر پر جا کر فطرت سے متعلق تحیّر آمیز تجربات سے دو چار ہو جاتا ہے۔کاش ہم شعور کی دولت سے محروم قوم فطرت کے اثاثوں کی حفاظت کرتے۔اور انہیں اپنے مادی ہوس کی بھینٹ نہ چڑھاتے۔

☆☆☆

بنتِ حوا سے حسنِ ادا

بنتِ حوا قدرت کی ایک ایسی تخلیق ہے جو انتہائی نازک' حساس اور لطیف جذبات کا پیکر ہوتی ہے۔ یقیناً عورت پیغمبر نہ بن سکی لیکن انبیاءؑ کا وجود اور افلاطونؔ و ارسطوؔ کی ذہانت و ذکاوت اسی کے آغوش سے وابستہ ہے۔ یہ ماں بھی ہوتی ہے۔ بیوی بھی' بیٹی بھی اور بہن بھی۔ غرض چار رشتوں اور چار جہتوں سے منسلک عورت ایک وجود کا نام ہے۔ یہ گھر کی رونق یا زیادہ موزون الفاظ میں ''چراغِ خانہ'' ہوتی ہے' اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے عورت اور مرد کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مرد اور عورت کا ایک دوسرے پر اعتبار اور انحصار معاشرے کو شاندار اور جاندار بنا دیتا ہے۔

موجودہ معاشرے نے عورت کے نازک آبگینے کو توڑ کے رکھ دیا ہے۔ اسے تجارتی اشتہارات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے جسم و جان کا استحصال کیا جاتا ہے' مشروبات کی بوتلوں پر اور پاؤں کے نیچے آنے والی چپلوں پر اس کی تصویر چسپاں کرنا عہدِ حاضر کا مزاج ہے۔ لیکن اسلام نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی تلقین کی ہے اور پیغمبر اسلامؐ کا یہ فرمان آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ''جنت تمہاری ماؤں کے قدموں میں ہے''۔ اسکی عزت' اسکی حفاظت اور اس کے ساتھ حُسنِ سلوک ایک انسان کے بہترین اعمال میں شامل ہے۔ عورت کو مرد کی غلام سمجھنا اِنتہائی ظلم و زیادتی ہے' یہ مرد کی رفیقِ زندگی' ساتھی اور ہمدرد ہے۔ جس خاندان میں عورت کی عزت نہیں ہوتی وہ خاندان زوال اور بربادی کا نمونہ بن جاتا ہے۔

عورتوں کی تذلیل کرنا' ان کے متعلق توہین آمیز الفاظ استعمال کرنا' ان سے غُلاموں اور خادموں کا سارویّہ اپنانا' قدم قدم پر انہیں تنگی اور تنگدستی سے دوچار کرادینا' انہیں مارنا اور رُلانا یہ سبھی باتیں انسانی تہذیب وتمدن کی روح کے منافی ہیں۔ مذاہبِ عالم عورت کی عظمت کے قائل رہ چکے ہیں اور ان سے حُسنِ سلوک روارکھنا عبادت کے مترادف ہے۔ ایک مرد کو تعلیم دے کر آپ صرف ایک فرد کو تعلیم دیتے ہیں اور ایک عورت کو تعلیم دے کر آپ ایک کنبہ کو زیورِ علم سے آراستہ کرتے ہیں۔ مشہور انگریزی شاعر جان ملٹن کا یہ قول کتنا معنی آفرین ہے۔ ''عورت سب سے اچھا اور سب سے آخری آسمانی تحفہ ہے''۔ مرد جب عورت کے ساتھ حسن سلوک کا طریقہ اپناتا ہے تو گھر کا پورا ماحول جنّت کا ساسماں پیدا کرتا ہے اور عورت کے ساتھ غیر انسانی سلوک عملاً گھر کو جہنم میں بدل دیتا ہے۔ زندگی کے دشوار گذار راستے عورت کی محبت اور رفاقت کے بغیر طے نہیں ہوسکتے۔ کسی دانا نے آسمان کے ستاروں کو نظموں سے تشبیہہ دی ہے اور کہا ہے کہ عورتیں زمین کی نظمیں ہیں۔ عورت سے حسنِ سلوک تاریک دلوں کو مشعلِ ہدایت بنادیتا ہے۔ ہاں عورتوں کو بھی اپنا گھر صاف وشفاف پرسکون اور پُرامن بنانے میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔ ظاہری رکھ رکھاؤ' بناوسنگھار اور چڑ چڑے پن سے احتراز کر کے مرد کو کبھی مشتعل ہونے کا موقعہ فراہم نہیں کرنا چاہیئے' آج اکثر و بیشتر گھروں میں مردوں کے لیے خواتین کے مطالبات اور شادی بیاہ کے موقعوں پر انکی تجاویز پریشانیوں کا باعث اور انہیں بالائی یا حرام آمدنی کو جنم دینے کا سبب بن جاتی ہیں۔ ہماری سوسائٹی میں ہزاروں گھرانے ساس اور بہو کے درمیان تلخ کلامیوں' حیلہ سازیوں اور دیگر کلامی نزاکتوں کے سبب جہنم زار بنے ہوئے ہیں چنانچہ چند سال پہلے سرینگر میں ایک گھر کی نئی نویلی دلہن نے اپنی ناخواندہ ساس سے انگریزی میں جب Spoon (چمچہ) کا لفظ استعمال کیا اور ساس سے اس کے

بارے میں استفسار کیا تو اَن پڑھ ساس نے اس سے پوچھا وہ کیا ہوتا ہے؟ انگریزی سکول کی پروردہ لڑکی پکار اٹھی Oh, God she does not understand ساس نے کچن کا یہ ماجرا شام کو اپنے بیٹے کے سامنے پیش کیا' چنانچہ یہی واقعہ اس قدر طول پکڑ گیا کہ طلاق پر اختتام پذیر ہو گیا۔

ے تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ اموَمت
ہے حضرتِ انسان کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

ایک گھر میں مرد اور عورت دونوں جب اپنے حقوق اور ذمہ داریوں میں توازن' تناسب اور احساس کا جذبہ پیدا کرتے ہیں تو گھر کا ماحول پُرسکون' پرامن اور جنت زار بن جاتا ہے۔ اور یہی توازن اگر بگڑ جاتا ہے تو خانگی سکون ہنگامہ آرائی میں بدل جاتا ہے۔
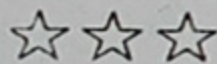
ہمارا گردو پیش......ذمّہ داریوں کا احساس

ایک صحت منداور متوازن سماج کی صحیح تصویراس وقت ابھر کر سامنے آتی ہے جب ہر فرد اپنے
فرائض اور ذمّہ داریوں کو محسوس کر کے سوسائٹی کی تعمیر و تشکیل میں اپنا حصّہ ادا کرتا ہے۔ معلوم
نہیں ہمارے مزاج میں یہ کون سا حیاتیاتی سقم موجود ہے کہ ہم میں سے اکثر اپنی سماجی ذمّہ
داریوں سے غفلت برت رہے ہیں ۔ ماحول یا اپنے گردو پیش کو غلاظت سے، کوڑا کرکٹ
سے، خس وخشاک سے، اوراذیت رساں چیزوں کے استعمال سے پاک وصاف رکھنا ہم میں
سے ہرایک کا اخلاقی فریضہ ہے۔ ہم لوگ اپنے صحن، اپنی پارک، یا اپنی کوٹھی کے خیابان کو ہر
طرح سے سجانے میں کوئی کمی یا کوتاہی روانہیں رکھتے ہیں، جبکہ شاہراہوں، سڑکوں اور گلی
کوچوں کی خستہ حالی اور پامالی کا ہمیں کوئی احساس نہیں ہے۔ سرینگر شہر کی اکثر نئی بسائی گئی
بستیوں میں مکانات اوران سے جڑے ہوئے صحن اور'لان' اپنی ایک منفرد شان رکھتے ہیں،
لیکن ان بستیوں کے تنگ کوچے تنگیٔ داماں کی ایسی روداد بیان کرتے ہیں کہ مشکل سے ایک
ماروتی کار کا گذر وہاں سے ہوسکتا ہے۔ ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء کی صبح کو میں لال چوک سے یونیورسٹی
کی طرف سفر کررہا تھا کہ سعیدہ کدل میں انہدامی کارروائی کے سبب ہنگامہ سا برپا تھا کہ سومو
ڈرائیور نے گاڑی کاٹھی دروازہ کے اندرونی علاقوں اور پھر احمدا کدل اور لال بازار کے تنگ و
تاریک گلیاروں سے بڑی پریشانیوں کے بعد حضرت بل پہنچادی۔ مکانات کی شان وشوکت،
اور باہر سے نظر نواز درونِ خانہ نزاکتوں سے جہاں لوگوں کی ظاہری خوشحالی دیکھ کر بڑی

مسرت ہوئی لیکن گلی کوچوں میں پڑی آلودگی اور انکی زبردست تنگی سے بڑی وحشت ہوئی۔ مجھے ایسا لگا کی ابھی ہمیں باہر کے ملکوں میں موجود سماجی شعور اور نظامِ تمدّن کے ساتھ برابری پیدا کرنے میں ایک ایک طویل زمانہ درکار ہے۔ بیجنگ چین کی زرعی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے چند سال پہلے راقم کے ساتھ ایک گفتگو میں کہا تھا کہ ہندوپاک کے لوگوں کو چینیوں کے معیار، محنت، سچائی اور ترقی کے ساتھ مقابلہ کرنے میں چند صدیاں لگیں گی۔

کشمیر میں مختلف حکومتوں کے زیرِاہتمام باغوں، پارکوں اور سڑکوں پر ''پوٹ اِن می'' ''تھینک یُو'' وغیرہ ڈبے اور ڈرم نصب کئے تھے تاکہ مستعمل چیزیں ان میں ڈال دی جاتیں لیکن ہم لوگوں کے اعلیٰ شہری مزاج نے وہ ڈبےّ، پارکوں کی دیوار بندی میں استعمال شدہ پتھر، اور لوہے کے سلاخ اپنے گھروں میں پہنچادیئے، اور اس طرح ہم سب اپنے ماحول کو بگاڑنے، اپنے گلی کوچوں کو عفونت کے اڈوں میں تبدیل کرنے، اپنے جنگلوں سے سرسبز درخت کاٹنے، اپنے آبی وسائل کو برباد کرنے اور جہلم جیسے تاریخی دریا کو ایک بڑی ڈرین میں تبدیل کرنے کے جرم میں ملوث ہیں۔

فطرت اَفراد سے اِغماض تو کر لیتی ہے
نہیں کرتی ہے ملّت کے گناہوں کو معاف

۱۹۹۳ء کے اوائل میں کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ ریاضی کے ایک نامور استاد اور معروف نکتہ سنج پروفیسر قاضی غلام محمد مرحوم سَرا کاسؔ امریکہ میں اپنے بیٹے کے پاس گئے تھے۔ واپسی پر انہوں نے اپنے تجربات اور گہرے مشاہدات کا تجزیہ پیش کیا۔ مرحوم کا بیان تھا کہ ایک بار کسی غیر امریکی نے سڑک پر سگریٹ کا بٹ پھینکا اور پاؤں سے بٹ کو رگڑ کر آگے بڑھا۔ قاضی صاحب نے کہا ایک امریکی نے اپنے رومال سے وہ سیاہی مٹادی جو سگریٹ

پینے والے کے پاؤں کی رگڑ سے سڑک پر ظاہر ہوئی تھی۔ ایسے ہی درجنوں واقعات مرحوم نے سنائے تھے جن سے امریکی قوم کے ہاں ماحول کی پاکیزگی اور حفاظت کا اظہار ہوتا تھا۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اپنے گردوپیش کو کثافتوں سے بچانا اور اپنے اندر صحیح انسانی اور ماحولیاتی شعور پیدا کرنا وقت کی پکار ہے۔ باضمیر، باشعور اور پاکیزہ فطرت رکھنے والوں کا طریقہ یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کو جہاں پاکیزگی، طہارت اور خوشحالی کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں وہاں وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو بھی پاک وصاف رکھنے میں بھرپور دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔
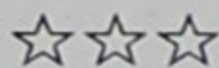
جہلِ مُرکّب

جہالت کی متفرق انواع واقسام ہیں اور ہر نوع اور قسم کے جہل کی پشت پر ایک جداگانہ نفسیات کارفرما ہوتی ہے۔ جہل انفرادی بھی اور اجتماعی بھی ہوتا ہے۔ ویسے جاہل ہونا کوئی عیب بھی نہیں ہے، کیونکہ قرآن کے الفاظ میں انسان ''ظلوم وجہول'' ہے، اگر چہ مفسّرین وشارحین نے انسان کی دوسری جبلت کا ان دولفظوں کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے یعنی عادل اور عالم۔ ظلم کو خیر باد کہہ کر آدمی عدل کے تقاضے پورا کرسکتا ہے اور جہل کو ترک کر کے علم کی روشنی سے آراستہ ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ دونوں صفتیں اور جبلّتیں انسان میں موجود ہیں۔ جہل کے مختلف عناصر، اجزا اور عوامل، خواص میں بھی اور عوام دونوں میں کہیں کم اور کہیں زیادہ کار فرما رہتے ہیں، لیکن انسانوں کی ایک قسم جہلِ مرکب میں مبتلا ہوتی ہے۔ ایسے جہلاً کے بارے میں قرآن پاک کا بھی یہی ارشاد ہے کہ اللہ کے بندے زمین پر انکساری وعاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہلوں کے ساتھ ان کا پالا پڑتا ہے تو وہ بسلامت گذرتے ہیں۔

مجھے تمیں سال کے طویل روزانہ کے گھر سے شہر کے سفر میں ہر قسم کی مسافر بسوں میں سفر کرنے کا موقعہ ملا ہے اور جہلِ مرکب سے بہرہ ور بے شمار انسانوں سے سابقہ پڑا ہے۔ میں نے دانشگاہِ کشمیر میں اعلیٰ پایہ کے چند پڑھے لکھے جہلاً کو بھی دیکھا اور سنا ہے، چنانچہ جہل کے مرکبات واجزا بازارِ جہالت اور مرکز علم وآگہی دونوں جگہ یکساں طور موجود ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ وہ جہل جس کے پیچھے خلوص ہو، اس علم سے ہزار درجہ

بہتر ہے، جو تعصب، ریا اور نفاق کا پروردہ ہو۔ انبیاؑ عظامؑ اور اولیاؒ کرامؒ میں سے اکثر ظاہری علوم وفنون اور کتابی حقائق ودقائق سے نا آشنا تھے لیکن حقیقی علم کے جو راستے انہوں نے کھول دیئے، دنیا کی آبادی کا بڑا حصّہ آج بھی انہی راہوں پر چلنے اور ان راستوں کے گرد و غبار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہتا ہے۔

انسان کے لیے لازمی ہے کہ وہ جہل کے بجائے علم کی تلاش میں محوِ سفر رہے۔ جاننے اور اشیاءٔ کا علم حاصل کرنے کے بعد یہ کہے کہ میں ابھی کچھ بھی نہیں جانتا ہوں، بجائے اس کے وہ چند اوراق اور چند کتابوں کے مطالعے کے بعد عقلِ کُل کا دعوی دار بنے۔

ایک فارسی شاعر نے بہت ہی پتے کی بات کہی ہے اور یہ ہر صاحبِ علم ودانش کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔

آنکس کہ بداند و بدندا کہ نداند
اسپ طربِ خویش بہ افلاک رساند
وانکس کہ بداند و بداند کہ بداند
او ہم خرکِ لنگ بہ منزل بر ساند
وانکس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہلِ مرکّب اَبدالدہر بماند

ترجمہ:۔ جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں نہیں جانتا ہوں۔ وہ اپنی خوشی کا گھوڑا آسمانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اور جو شخص جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں وہ بھی اپنا لنگڑا گدھا منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اور جو شخص نہیں جانتا ہے اور جانتا ہے کہ میں جانتا ہوں، وہ ہمیشہ جہل مرکب میں مبتلا رہتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں جہالت کی بے شمار قسمیں موجود ہیں۔ ہمیں سماجی ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہے، لیکن خودغرضی اور جہل مرکب کے سبب ان کو پورا کرنے سے پہلوتہی برتتے ہیں۔ گفتگو میں جہالت، لین دین کے معاملات میں جہالت، سڑک پر گاڑی چلاتے وقت جہالت کے بدترین مناظر، سیاست کے امور میں جہالت، نظام تمدن میں جہالت اور آجکل سردی کے ایام میں مساجد سے منسلک حماموں کے گرم پتھروں پر جہل مرکب کے نمونے

؎ جہلِ خرد نے وہ دن دکھائے
گھٹ گئے انسان بڑھ گئے سائے
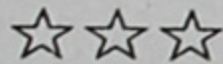
علم کے حقائق و اَہداف

ایک طالب علم، ایک استاد اور ایک محقق کے لیے علم کی حقیقتوں کا ادراک و احاطہ کرنا ہر دور میں ناممکن رہا ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی اس کی وسعتوں کو فکر کے سانچوں میں ڈھالنا محال ہی ثابت ہوگا۔ انسان کا ذہن انتہائی محدود اور اس کائنات میں مناظر و مظاہر کا علم لامحدود ہے۔ زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اشیاً کی حقیقت کو سمیٹنا، انکی ہیئت و صورت پر غور و فکر کرنا، انکو تجربہ گاہوں میں لے کر تجزیہ و تحلیل کے عمل سے گذارنا، یہ سب کچھ اپنی جگہ درست، لیکن بالآخر دنیا کا ایک ذہین ترین انسان افلاطون پکار اٹھا۔ "I know only I know that I know nothing" میں جانتا ہوں، بس اتنا جانتا ہوں کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا ہوں۔ علم کی درجنوں قسمیں ہیں، لیکن خاص علوم میں دینی اور دنیوی، ظاہری اور باطنی مشرقی اور مغربی مشہور بھی ہیں اور معروف بھی۔ عجیب بات ہے کہ آج تک کسی نے جنوبی اور شمالی علوم کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کہیں ان کا اتہ پتہ ہے۔ مشرق چونکہ روشنی کے سب سے بڑے مرکز کا مقامِ طلوع اور مغرب اس کا بظاہر مقامِ غروب ہے، اسی لیے لوگ مشرقی و مغربی علوم کا ذکر کرتے ہیں۔ ابن بطوطؔہ نے علم کو دو خانوں میں تقسیم کیا تھا، علم اُلادیان اور علم اُلابدان۔ بہر حال علم جتنے بھی ہیں اور جس موضوع اور جس خطۂ زمین سے بھی تعلق رکھتے ہیں، اصل میں انسانی وحدت، بقائے باہمی، اور اس عظیم خالقِ ہستی سے اپنا تعلق جوڑنے اور اپنے آپ کو اس کے قریب تر کرنے کا دوسرا نام ہے۔ علماً کا درجہ نہایت بلند ہے۔ ان کی

کوششوں سے ہی دنیا کے کتب خانے آباد ہو گئے، اندھیرے اجالوں میں بدل گئے۔ غور و فکر، محنت و مشقت اور مشکلات برداشت کر کے انہی عالموں، فاضلوں، محققوں اور دانشوروں نے علم و حکمت کے چراغ روشن کیے، جن سے آج کا انسان محظوظ ہو رہا ہے۔ عبدالکریم شہر ستانی نے اپنی ایک کتاب "مِلل و نحل" میں لکھا ہے۔ "بوعلی سینا کا طریقہ اپنی متانت کے ساتھ دقیق بھی ہے اور اسکی نظر حقیقتِ اشیأ کی معرفت میں زیادہ عمیق بھی۔ تمام حکما و اطبأ کا پیشوا سمجھا گیا"۔ انکی علمی محنت و مشقت کے بارے میں یہ شعر مشہور ہے،

پنجاہ و دو سال صرف کردم شب و روز
معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

یعنی اپنی زندگی کے باون سال شب و روز اسی علمی کام میں لگا دیئے لیکن پھر بھی یہی معلوم ہوا کہ کچھ نہیں معلوم ہوا۔ تین سو سال تک بوعلی سینا کی کتاب "القانون فی الطب" یورپ کے میڈیکل کالجوں کے کورس میں انگریزی ترجمے کے ساتھ شاملِ نصاب تھی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ اقبالؒ بوعلی سینا کی علمی کاوشوں کو داد و تحسین دے چکے ہیں لیکن حضرت جلال الدین رومیؒ کے علم و عرفان کو ہی اقبال کامیابی سے ہمکنار تصور کرتے ہیں۔

بُو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومؔی پردۂ محمل گرفت

بوعلی، علم و حکمت کی اونٹنی کی راہ کے گرد و غبار میں گم ہے۔ رومی کے ہاتھ نے اونٹنی (سواری) کا پردہ پکڑ لیا ہے۔ (یعنی رومؔی منزل مراد پا گیا) وہ علم جو منزل مراد کی رہنمائی کے بجائے گمراہی کی طرف لے جائے وہ علم نہیں بلکہ عشق و آہ کے سرمایے کے لیے راہزن کا کام کرتا ہے۔ علم اگر بدگوہر اور کج فطرت بنتا ہے تو اقبال اسے حجابِ اکبر (بہت بڑا پردہ)

قرار دیتے ہیں ۔ کتنے عالم، فاضل ،دانشور ایسے بھی ہیں جو فقط نری دانشوری، ریاکاری، عیاری اور جہاں داری کے لیے اپنے علم کا ستعمال کرتے ہیں اور ایسے بھی عالم و فاضل موجود ہیں جو علم کے نام پر جہل، دجل، دقیانوسیت اور قدامت کے ایسے اسباق پڑھاتے ہیں کہ روشنی کے اس دور میں انکے علم و ہنر پر کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔ ہمارے گرد وپیش میں ہزاروں پروفیسر، ڈاکٹر اور آفیسر موجود ہیں جن کے پاس علم اور تحقیق کی بڑی بڑی ڈگریاں ہیں۔ وہ اپنی تعلیم اور تحقیق کو باضابطہ سرراہِ بیچ دیتے ہیں۔ اور ان لوگوں سے بھی یہ سماج محروم نہیں ہے، جو علم کو عام کرنے، تعلیم کے نور کو پھیلانے ،انسان سازی اور مردم دوستی کو بڑھاوا دینے اور صالح قدروں کی آبیاری کرنے میں اپنی طاقت ،توانائی ، صلاحیت اور وقت کو استعمال میں لاکر علم کے حقیقی وارث اور خادم بننے کی سعی و جہد کر رہے ہیں۔

آج کی دنیا کو ایک بار پھر اسی علم کی روشنی سے منور ہونا ہے، جس علم کی بنیاد خدا کے انتہائی پاکباز، صالح، سچے اور ہر اعتبار سے کامل بندوں نے استوار کی ہے، ورنہ آج کا علم اور تعلیم انسانی شکل میں وحشیوں، درندوں، اور مادیت کے پرستاروں ے ہاتھوں میں آچکا ہے

ے تعلیم کے تیزاب میں ڈال اسکی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر
(اقبالؒ)

☆☆☆
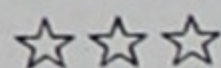
مقامِ شبیریؓ

سرفروشی اور انقلابی زندگی کی تاریخ میں متعدد نام ایسے ہیں جن کے عزم وثبات اور اخلاصِ عمل کو جدو جہد پر یقین رکھنے والے ہر عہد میں سلام پیش کرتے رہیں گے۔ حق پرستی اور اعلیٰ قدروں کی آب یاری کرتے کرتے انہوں نے تکالیف اور مصائب کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا ہے۔ ان کے اردگرد جب حادثات کی تند و تلخ ہوائیں چل رہی تھیں تو جبینوں پر ایک بھی شکن موجود نہیں تھی۔ سرفروشوں کے اسی کاروان کا ایک اہم ترین نام جناب حسین ابن علیؓ ہیں، جن کی رگوں میں بدؔر و حنیؔن کی ایمانی حرارت موجزن تھی، اور جن کے لہو میں نبوّت وولایت کا تقدس کارفرما تھا

تاریخ دے رہی ہے یہ آواز دم بدم
دشتِ ثبات و عزم ہے دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیؔح و جرأتِ سقراط کی قسم
اس دشت پہ ہیں ایک ہی انسان کے قدم
جسکی رگوں میں گرمیٔ بدؔر و حنیؔن ہے
''سبطِ نبیؐ'' کا اسمِ گرامی حسینؓ ہے
(جوشؔ)

خاندانِ نبوت کا احسان صبحِ قیامت تک مسلمانوں کے ایمان و یقین پر ہے، لیکن

عہدِ بنوامیہ کے ہوس پرست حکمرانوں نے خلافت کے نام پر ملوکیت کے مزے لوٹنے کے لیے اس تقدس مآب گھرانے کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا، وہ تاریخ کے اوراق پر محفوظ ہے۔ ایک طرف نبیؐ اور آلِ نبیؐ پر درود و سلام اور دوسری طرف دریائے فرات کے رواں دواں پانی کی فراہمی ان پر بند۔ ایک طرف اسلامی سلطنت میں وسعت اور ہمہ گیری کا دعویٰ اور دوسری طرف خانوادۂ رسالت سے ازلی دشمنی کا مظاہرہ۔ ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیئے۔

حق و باطل کے درمیان کشمکش ہر دور میں رہی ہے اور آئندہ بھی صداقت و شرافت کے پرستاروں اور کذب و افترا کے علمبرداروں کے یہاں یہ کشمکش، یہ آویزش اور یہ معرکہ آرائی مختلف صورتوں میں ظہور پذیر رہے گی۔ موجودہ دور میں بھی حق و انصاف اور ظلم و جبر کے درمیان ٹکراو قائم ہے اور آج بھی حق پرست باطل قوتوں کے ہاتھوں گوناگوں مظالم سہہ رہے ہیں

ے حق پرستوں سے زمانے کی دَغا آج بھی ہے
ترے بندوں پہ ستم میرے خدا آج بھی ہے

کربلا کے ریگزار پر شہید کربلا نے ایمانی جرأت اور اعلائے کلمۂ حق کی ایسی تاریخ رقم کی کہ ایک پورا خاندان خاک و خون میں نہلایا گیا، لیکن زبانوں پر شکوہ و شکایت کا کوئی لفظ نہیں آیا، اور منافقوں اور فاسقوں کی اطاعت ہر حال میں مسترد کر کے رکھ دی

چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن تو فاسقوں کی اطاعت نہ کر قبول

طاغوتی قوتیں جب بھی حق و صداقت کے اصولوں کو دبانے کی کوشش کرتی رہیں گی، مقامِ شبیریؓ پر سرفراز حق پرست ان قوتوں کا مقابلہ کرنے میں کوئی کوتاہی روا نہیں رکھیں گے۔ یہ حق و باطل، خیر و شر، ظلم و انصاف اور سیاہ و سفید کی جنگ ازل سے جاری ہے اور آنے

والے زمانوں میں بھی یہ صورت قائم رہے گی، تاہم عدل و برابری اور توازن و تناسب کے فطری اصولوں پر کاربند جیالے کامیابی و سرخروئی کے مقام پر فائز رہیں گے۔ کربلا میں بظاہر حسینؓ ہزیمت سے دوچار ہو گئے، لیکن ان کے کامل اعتماد، لِلٰہیت، عزیمت، اخلاص اور جذبہ جہاد نے حقیقتِ ابدی کی زرّیں سرگذشت مرتب کی۔ اسی شوقِ شہادت نے انہیں وہ زندگی عطا کی کہ ڈیڑھ ہزار سال گذر جانے کے بعد بھی کروڑوں سُنّی، شیعہ اور محبّانِ خانوادۂ رسالت ان کے ناموں کے حرفوں پر اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔

کربلا وادیٔ سینا سے بہت آگے ہے
اس کے ذرّات پہ قربان ہیں پروین و پَرن
ہر گھڑی اس کو مدینے سے پہنچتا ہے سلام
یہ وہ مَشہد ہے کہ ابنِ علیؓ کا مدفن
روحِ اسلام میں شاہی کا تصوّر ہی نہیں
ہیچ ہیں اسکی نگاہوں میں سلاطینِ زَمن

☆☆☆
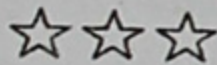
تصوّرِ وقت اور انسانی زندگی

وقت...... آنات، لمحات، واقعات، محسوس اور غیر محسوس کیفیتوں، خاصیتوں اور دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ یہ حالات و واقعات کا خالق بھی ہے اور ماضی سے وابستہ بھولی بسری، تلخ و شرین یادوں کا نقاّش بھی ہے۔ انسان کی زندگی وقت یا قرآن پاک کی اصطلاح میں ''عصر'' کے ساتھ پیوستہ ہے۔ جو لوگ وقت کی قدر کرتے ہیں، ہر لمحہ اپنے عمل کو درست کرتے ہیں، خیر کے امور میں وقت کو بروئے کار لاتے ہیں اور ہر شام اپنے دن بھر کے کاموں کا جائزہ لیتے ہیں، یقیناً کامیابی ان کے قدموں میں آجاتی ہے۔ وقت...... ماضی، حال اور مستقبل کے تین حصّوں کی زنجیروں سے ملا ہوا ہے۔ وقت کی یہ درجاتی تقسیم انسانی زندگی میں نقش ہائے رنگ رنگ پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ماضی اپنے پیچھے یادوں کے نقوش چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں ہر شخص وقت کی پہلی زنجیر ماضی کا ستایا ہوا ہے سب اس کے زخم خوردہ ہیں۔ لیکن اسے کسی کی زبوں حالی اور بے کسی پر کبھی رونا نہیں آیا۔ ادب، تاریخ اور فنون لطیفہ تینوں ماضی کے ظلم و جبر کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔

وقت برا بھی اور بھلا بھی ہوتا ہے۔ بُرے اوقات میں رنج و غم اور درد و کرب کی حکمرانی ہوتی ہے اور بھلے وقت میں مسرتوں اور خوش بختیوں کا نُزول ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اللہ کے پاکباز بندوں کا طریقہ شکر گذاری کا رہا ہے۔ قرآن پاک میں خدا وقت کی قسم کھا کر فرماتا ہے' کہ ''انسان گھاٹے میں ہے، لیکن وہ لوگ جو ایمان لائے، اعمالِ صالحات انجام

دیتے رہے، حق وصداقت پر قائم رہے اور صبر کا دامن تھامتے رہے وہ نقصان سے مستثنیٰ ہیں''۔
ہم میں سے کتنے لوگ وقت کا برمحل استعمال کرتے ہیں؟ وقت کی نزاکتوں کا احساس رکھتے ہیں۔ دراصل زمانہ وقت کا دوسرا نام ہے اور پل، گھڑی اور لمحہ وقت کے اجزائے ترکیبی ہیں، جن سے اِمروز وفردا ترتیب پاتے ہیں۔ اس لیے وقت ہاتھ آجائے تو بہرہ ور ہونے اور محظوظ ہونے کی سعی کی جانی چاہیے، کیونکہ ہر لمحہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ اردو کے معروف شاعر احسان دانش نے اچھی بات کہی ہے۔

''ہر آنے والا لمحہ ایک نئے زمانے کا آئینہ دار ہے۔ اس میں کبھی گزرے ہوئے زمانے کے واقعات لوٹ کر نہیں آسکتے''۔ مگر مورّخ بالخصوص ابنِ خُلدون کا یہ نظریہ ہے کہ ''تاریخ ماضی کا ایک مرقع ہے، جو اپنے آپ کو دہراتی ہے''۔

تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے یہ بات عیاں ہے کہ قوموں کے عروج وزوال اور تہذیبوں کے اقبال و اِدبار میں وقت کا ہاتھ کارفرما رہا ہے۔ جب سے صفحۂ زمین پر تہذیب وتمدّن کے نقوش بنے ہیں، اس وقت سے دنیا کے اہل دانش وبینش دیکھ رہے ہیں کہ جن قوموں نے وقت کی قدردانی کی، دنیا کی قیادت وسیادت ان کے ہاتھوں میں آگئی اور وقت کی ناقدری کرنے والی اقوام وقت کے ہاتھوں پیچھے دھکیل دی گئیں۔
احادیث نبویؐ میں متعدد مقامات پر وقت کی اہمیت پر ضرور دیا گیا ہے چنانچہ ''لِی مَعَ اللہِ وقت'' اور لَا تَسبُّو الدَّھر...... وقت کو برامت کہو سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ وقت ایک کائناتی حقیقت ہے جس کے ساتھ حیاتِ انسانی کے مختلف مدارج کو جوڑ دیا گیا ہے۔

زندگی از دَہر و دہر از زندگی است
لا تسبو الدہر فرمانِ نبیؐ است

زندگی وقت سے اور وقت زندگی سے جڑا ہوا ہے۔ زمانے کو برا مت کہو یہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

تارِ عنکبوت

انسانی دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ''قرآنِ حکیم'' نے دنیا کو بیتُ العنکبوت (مکڑی کا گھر) سے تشبیہ دی ہے۔ مکڑی کا گھر پتھروں، اینٹوں، لکڑیوں اور آہنی میخوں سے نہیں بلکہ نازک تاروں کی منصوبہ بندی سے تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اس جالے کے بنانے میں مکڑی کن مرحلوں سے گزرتی ہے وہ دیدنی منظر ہوتا ہے اور یہی حال انسان کے ہاتھوں بنائے گئے گھر کی بھی ہوتی ہے۔ گھر کی تعمیر کے اولین پتھر سے لیکر چھت کی آخری کیل ٹھونکنے تک آدمی کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو زندگی میں تعمیر کے صبر آزما مرحلے سے گذرتے ہیں۔

یقیناً انسان کے لیے ایک گھر کی تعمیر لازمی اور لابدی ہے، لیکن وہ جو گھروں کی چار دیواریوں کے بغیر زندگی گزارتے ہیں، ان کا بھی ایک نظریۂ حیات ہے۔ ایک ایسے ہی بے گھر آدمی سے جب میں نے پوچھا تو اس نے دنیا کی بے ثباتی، ناپائیداری اور نامحکمی کا ایسا منظر نامہ پیش کیا، کہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس بے گھر گنوار قسم کے آدمی نے مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ بے خانماں شخص کی گفتگو سن کر مجھے میر غلام رسول نازکی مرحوم یاد آ گئے جنہوں نے قرآن کے تصورِ حیات کو ایک رباعی میں نہایت ہی عمدگی سے پیش کیا ہے

پرژم زارین دونِکھ چالاہ چھُ دنیاہ
پچھن ہندی کین اوڈر مالاہ چھُ دنیا

دپاں دانذر نذرء والاہ چھُ ۔ دنیاہ
قرانن وون زلرٔ زالاہ چھُ دنیاہ

ترجمہ:۔ میں نے جواری سے دنیا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ یہ دنیا ایک چال ہے ۔قصائی نے دنیا کو ایک نم اور تر مال گردانا، سبزیاں کاشت کرنے والے نے دنیا کو سرکنڈے کا نازک بال قرار دیا، لیکن قرآن نے دنیا کو مکڑی کے جال سے مشابہ کیا ہے۔

انسان یہ جانتے ہوئے کہ دنیا انتہائی بے ثبات شے ہے، اس میں رہنے کے لیے مضبوط ترین اشیأ کا سہارا لیتا ہے۔ ایسے منصوبے بناتا ہے کہ جیسے ہزار سال تک اسکو جینا ہے۔ لالچ، طمع، ہوس، خواہش اور رہائش کے ایسے تانے بانے بُنتا ہے، کہ بعد میں انہی دائروں میں سمٹ سمٹ کے رہ جاتا ہے۔ بغداد کا ایک عالم ایسا ہی منظر دیکھ کر شہر کی راہوں سے بلند آواز میں چلاّ نے لگا۔ ''اے لوگو، موت کا فرشتہ مر گیا''۔ سننے والے اس عالم کے حیران کن جملے سے ششدر رہ گئے۔ ان سے پوچھا گیا۔ حضرت! بات کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ''میرے ایک ہمسایہ کی عمر اس وقت نوے سال ہے، اس نے آئندہ سو سال کے لیے زمین کا ایک قطعہ زراعت و باغبانی کی خاطر پٹے پر لے لیا۔ لہٰذا میرا یہ اندیشہ ہے کہ عزرائیل رحلت کر گئے ہیں''

؎ کیا ہے تو متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں، لا اِلٰہ الا اللہ

عنکبوتی تاروں کے جال میں آ کر آدمی اپنی فکر کی وسعتوں، اور ان صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو جاتا ہے، جو اسے تمام مخلوقات میں امتیاز بخشنے کی ضامن تھیں۔ اَنا پرستی، خود بینی، خود غرضی ،اقربا پروری اور مفاد پرستی کے دائروں میں پھنس کر انسان کی زندگی اختتام کی شام کو پہنچ جاتی

ہے۔فکرِ انسانی کی اگر چولیں ڈھیلی ہوں اور اس کے تار کمزور ہوں تو انسانی فکر و عمل میں ڈھیل اور جھول منطقی نتائج ہیں جو تارِ عنکبوت کے ہی برابر ہیں۔ دنیا میں بڑے وقار اور اعتبار کے ساتھ جینا بہت ضروری ہے، لیکن انسان کے ذہن میں یہ بات نقش رہنی چاہیئے کہ یہ دنیا کسی کی وفادار نہیں۔ یہاں محبتوں اور عنایتوں کو بانٹنا، صحت مند خطوط پر سوچنا، دوسروں کے کام آنا، اور ہومرا کام غریبوں سے محبت کرنا اگر آدمی کا وطیرہ بن جائے تو اسکی عنکبوتی تاریں اس کے لیے تارِ حیات بن جاتی ہیں اور انسان لافانی بن جاتا ہے

ے آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ، کارِ جہاں ثبات
ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
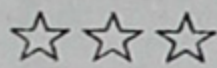
ہماری مطبوعات ایک نظر میں:

نام کتاب	مصنف	قیمت	عالمی معیاری کتاب نمبر: ISBN
غالب جہانِ دیگر	پروفیسر حامدی کاشمیری	300/-	978-81-909941-4-9
اُردو نظم کی دریافت (۲ جلد سیٹ)	پروفیسر حامدی کاشمیری	350/-	978-81-909941-2-5
اُردو نظم کی دریافت (۲ جلد سیٹ)	پروفیسر حامدی کاشمیری	350/-	978-81-909941-3-2
کشمیر قلم	محمد یوسف ٹینگ	450/-	
جدید فارسی شاعری کا عصری شعور	ڈاکٹر محمد شفیع خان	495/-	978-81-909941-0-1
بھدرواہ کے نمائندہ اُردو شعراءً	پروفیسر شہاب عنایت ملک	300/-	978-93-80591-14-5
جموں کشمیر کے اُردو افسانہ نگار	نور شاہ	300/-	978-93-80591-18-3
تجزیاتی مطالعے (حامدی کاشمیری کے مضامین)	جاوید احمد ماگجی	400/-	978-93-80591-
ریزہ ریزہ حیات	دیپک بدکی	200/-	978-93-80591-
پروفیسر مرغوب بانہالی بحیثیت اقبال شناس	ڈاکٹر پیر نصیر احمد	300/-	978-93-80591-
صحبتِ صالحین فکرِ اقبال کی روشنی میں	فیض احمد فیاض	300/-	978-93-80591-
اُردو ناول تنقید و تجزیہ	ڈاکٹر طارق تمکین	300/-	978-93-80591-
جموں کشمیر میں اُردو افسانہ (پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک)	محمد سلیم سالکؔ	350/-	978-93-80591-
ارمغانِ شہاب (جلد اول)	پروفیسر شہاب عنایت ملک	250/-	978-93-80591-
مضامینِ شہاب (جلد دوم)	پروفیسر شہاب عنایت ملک	300/-	978-93-80591-
اقبالؔ اور اقبالیات	پروفیسر عبدالحق	300/-	
عمر مجید کے بہترین افسانے	سلیم سالکؔ	250/-	978-93-80591-
ارمغانِ وادی	ڈاکٹر میر حسام الدین	300/-	
شبستانِ وجود (ایک صحافی کی سرگذشت)	مقبول صاحب	450/-	
سوغاتِ حجاز (کشمیری شرح ارمغانِ حجاز)	مولوی اسداللہ دھار	400/-	
ریزہ ریزہ حیات	دیپک بدکی	200	978-93-80591-29-9
تعلیقات اقبال	پروفیسر مشعل سلطان پوری	300	
موج بس موج	جاوید ماگجی	250	
اردو میں علاقائی ناول کا ارتقا	ڈاکٹر شگفتہ تبسم	400	978-93-80591-15-2
پروفیسر مرغوب بانہالی کی اردو ادبی خدمات	عمر احمد شاہ	300	

ورق ورق آئینہ	شہاب عنایت /فرید پربتی	450	978-81-909941-9-4
لَوَر ستاہ ستی نَنین ناولٹ	روف راحت	300	978-81-909941-7-0
نقات اردو	ڈاکٹر زور	350	978-81-909941-1-8
دیپک بدکی کی افسانہ نگاری	جاوید اقبال شاہ	300	978-81-909941-6-3
مجان اقبال	ڈاکٹر ریاز توحیدی	300	978-93-80591-00-8
حالی شبلی اور آزاد	ڈاکٹر چمن لعل بھگت	350	978-93-80591-09-1
برج پریمی کی ادبی خدمات	ڈاکٹر چمن لعل بھگت	250	978-93-80591-10-7
تقسیم ہند اور ناول کرماں والی	شاہینہ اختر	350	978-93-80591-13-8
شہ زور کاشمیری حیات اور شاعری	ڈاکٹر فرید پربتی	450	978-93-80591-21-3
گردش دوراں	حسن ساہو	300	978-93-80591-
نالہ نیل شب	ڈاکٹر مشتاق احمد گنائی	250	978-93-80591-
گراوتہ جواب گراؤ	مترگم گاوید ماٹجی	150	978-93-80591-
زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی	دیپک بدکی	250	978-93-80591-
ناول کا فن وارتقا اور لندن کی ایک رات	ڈاکٹر زور کاشمیری	100	978-93-80591-
قہر نیلے آسمان کا	سیدہ نگہت فاروق	200	978-93-80591-
عصری تحریریں	دیپک بدکی	**350**	978-93-80591-
عصری شعوری	دیپک بدکی	450	978-93-80591-
تعمیر سیرت (ریڈیائی تقاریر)	عبدالمجید خان	250	978-93-80591-
درس اخلاقیات	ابن حبیب	250	978-93-80591-
سونہ سادی اچھر	سیدی ختر حسین	170	978-93-80591-
ناول پریم چند اور میدان عمل	ڈاکٹر زور کاشمیری	100	978-93-80591-
کتاب دریچہ	محمد سلیم سالک	250	978-93-80591-
جموں کشمیر میں اردو زبان (ماضی حال مستقبل)	پروفیسر شہاب عنایت ملک)	800	978-93-80591-
تفہیم اقبال	فیض احمد فیاض	200	978-93-80591-
کل وسونی کول	ڈاکٹر کیرت سن گ ھینقلابی	250	978-93-80591-
غالب شناسی	ڈاکٹر چمن لعل بھگت	250	978-93-80591-
رشید احمد ڈیقی کا اسلوب	بشیر گلزار پوری	75	978-93-80591-
اردو غزل میں شاید بازی	ظہور شاہد اداظہر	90	978-93-80591-

میزان پبلشرز
بٹہ مالو سرینگر (کشمیر)

Meezan Publishers
Batamaloo, Srinagar (Kashmir)

مطبوعاتِ مصنّف

(۱) اقبال...... افکار و احوال
(۲) اقبال...... عرفان کی آواز
(۳) اقبال...... ایک تجزیہ
(۱۹) ارمغانِ نحویؔ
(۵) اقبال...... وحدت الوجود اور وحدت الشہود
(۶) اقبال کی تجلیات
(۷) اقبال...... بحرِ خیال
(۸) نفحاتِ اقبال
(۹) حکیم مشرق
(۱۰) Iqbal's Multiformity
(۱۱) Iqbal : Socio- Philosophical Ideas
(۱۲) Iqbal's Idea of Self
(۱۳) ''اقبالیات'' شمارہ نمبر ۱۲-۲۰
(۱۴) بیادِ شوریدہؔ کاشمیری
(۱۵) تاریخ الانبیاؑ (جلد اول، دوم، سوم)
(۱۶) وہ دانائے سبلؐ
(۱۷) گلشنِ مصفاؔ
(۱۸) مسائلِ تصوف اور اقبال
(۱۹) بیادِ خواجہ محمد امین بچھ
(۲۰) فکرِ آزادؔ
(۲۱) چشمۂ آفتاب

Meezan Publishers

Opp. Fire & Emergency Services H/QRS, Batamaloo, Srinagar 190009 Kashmir
Ph: 2470851 Fax 0194-2457215 Cell: 9419002212
Email: meezanpublishers@gmail.com / meezanpublishers@rediffmail.com

ISBN 978-93-80691-41-1